۲۴
مختصر کہانیاں
مترجم: عارف نقوی

۲۴
مختصر کہانیاں
مترجم: عارف نقوی
CHILDREN'S BOOK TRUST
NEW DELHI

۲۴
مختصر کہانیاں

مترجم: عارف نقوی
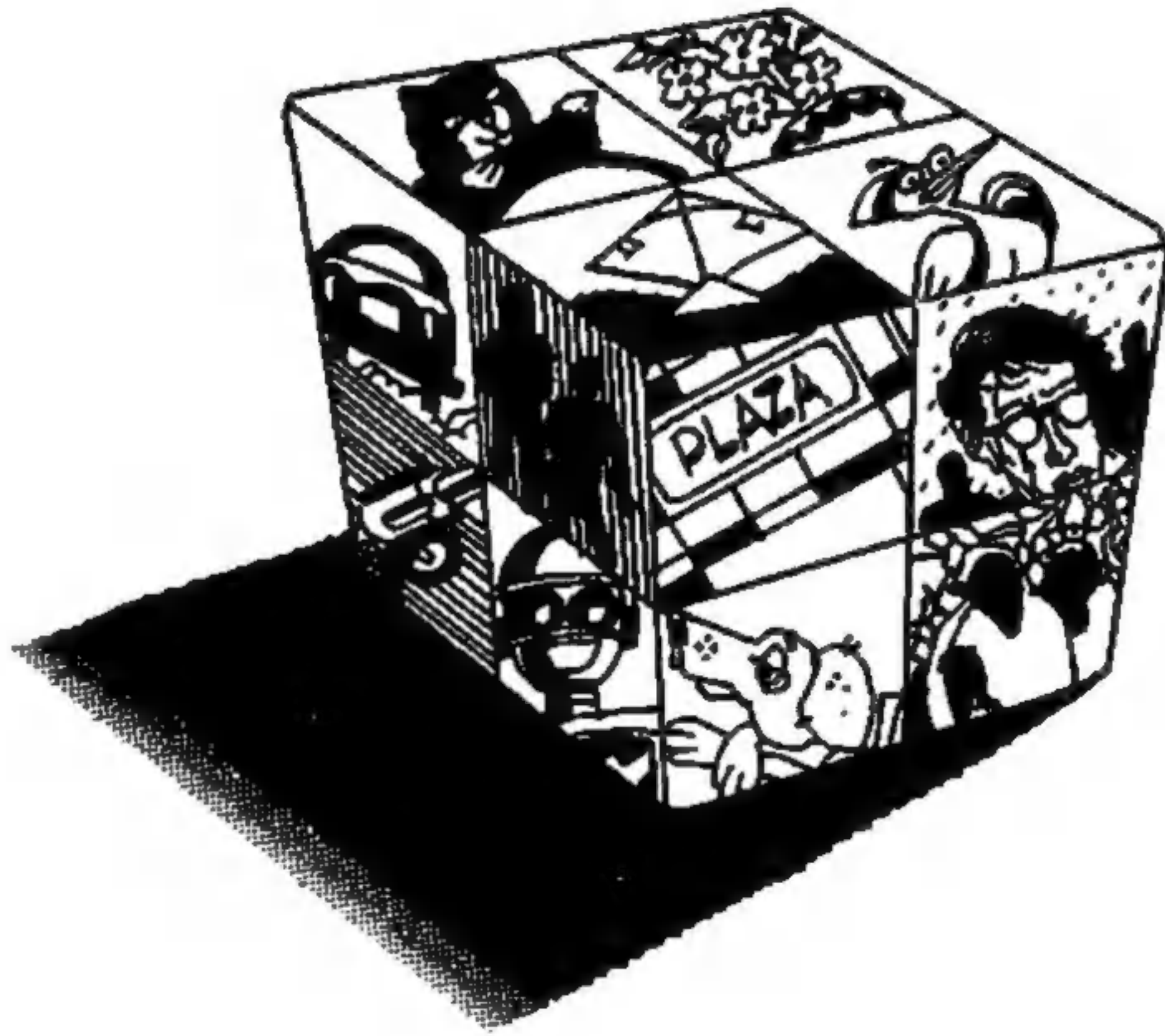
چلڈرن بک ٹرسٹ　　قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان　　بچوں کا ادبی ٹرسٹ

فہرست

نیلی موٹر سائیکل

راجن کے چاچا کے پاس ایک بہت خوبصورت موٹر سائیکل تھی۔ دیکھنے میں بالکل جادوئی لگتی تھی۔ مور کے پروں جیسے نیلے رنگ کی موٹر سائیکل۔ جس میں اسی رنگ کی ایک باسکٹ بھی لگی تھی۔ اور پیچھے دیکھنے کے دو شاندار آئینے بھی تھے۔ سچ مچ بہت ہی خوبصورت لگتی تھی۔ پورے محلے میں یہ پہلی موٹر سائیکل تھی۔ اس لئے راجن راتوں رات ہم سب لڑکوں میں راجہ بن گیا۔

اگلے دن کلاس میں ہم سب نے اُسے گھیر لیا۔ ہم سب موٹر سائیکل کے بارے میں جاننے کے لئے بے تاب تھے۔

"ہوا سے باتیں کرتی ہے۔ ایک لیٹر میں ۸۰ کلو میٹر چلتی ہے۔" راجن نے کہا اور اپنی دبلی پتلی ٹانگیں کرسی میں پیچھے موڑ کر ہلاتے ہوئے 'زوں زوں' کی آواز نکالی۔ "بہت طاقتور انجن ہے یار۔"

راجن کے چاچا اُس نئی موٹر سائیکل پر بمبئی سے آئے تھے اور تین ہفتے کے لئے راجن کے گھر رکنے والے تھے۔ ان تین شاندار ہفتوں میں جب دوپہر میں وہ سو جاتے تو ہم سب پیار بھری نظروں سے اُسے دیکھتے۔ تاکہ اُس کی تصویر اپنے دلوں میں بسالیں۔ کبھی کبھی راجن چپ چاپ اپنے چاچا کا لال ہیلمٹ اٹھا لاتا۔ اور ہم سب باری باری اُسے پہن کر موٹر سائیکل پر بیٹھتے۔ ہاتھوں میں کھجلی ہوتی کہ کس طرح انجن اسٹارٹ کر کے موٹر سائیکل لے کر رفو چکر ہو جائیں۔ شام کو جب ہم راجن کو اپنے چاچا کے ساتھ موٹر سائیکل پر سواری کرتے دیکھتے' تو جلن کے مارے ہمارے پیٹ میں مروڑ سی ہونے لگتی۔

راجن پہلے ہی بہت نقشے باز تھا۔ اب تو وہ ایسے اکڑ اکڑ کر چلتا جیسا دنیا کا سب سے گریٹ آدمی وہی ہو۔ ہم لوگ جب سائیکلوں پر اسکول سے لوٹتے تو وہ ہینڈل پر آگے جھک کر ایسے آنکھیں چڑھا لیتا جیسے سائیکل نہیں خواب میں موٹر سائیکل چلا رہا ہو۔

پیر کی صبح کو جب میں آسٹریلیا کے نقشے میں ماتھا پچی کر رہا تھا۔ راجن نے میرے کان میں کہا "یار میں موٹر سائیکل چلانا سیکھ رہا ہوں۔"

"ہونہہ...... تمھارے چاچا اتنے بدھو نہیں جو تمھیں اپنی موٹر سائیکل پکڑا دیں۔" میں نے منہ بنا کر اُسے چڑاتے ہوئے کہا۔

"شرط لگاتے ہو؟" راجن نے مجھے للکارا۔ اور ڈیسک پر آگے جھکتے ہوئے کہا "اتوار کو دیکھنا"

حالانکہ راجن موٹر سائیکل کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ اور وہی کیا ہم سب ہی اُس کے ایک ایک نٹ بولٹ اور تیلی کی جانکاری رکھتے تھے مگر اُسے چلانا 'سچ مچ چلانا' یہ بالکل الگ بات ہے۔ سب بڑے لوگوں کی طرح اُس کے چاچا کا بھی یہی ماننا تھا کہ موٹر سائیکل جیسی چیز چودہ سال کی عمر والوں کے بس کی بات نہیں۔ یہ ناانصافی ہے۔ سچ مچ۔ یہ لوگ ہمیشہ ہمیں ننھے منے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔

خواب دیکھنے میں کیا ہے' راجن جو چاہے خواب دیکھے۔ ہم سب ہی جاگتے میں خواب دیکھتے ہیں۔ مگر موٹر سائیکل چلا لینا۔ کبھی نہیں!

اتوار آ گیا اور دوپہر کے کھانے کے بعد مجھے راجن کی وہ ڈینگ یاد آئی' کوئی خاص کام نہیں تھا' اس لئے میں نے سوچا راجن کے پاس جا کر اُسے موٹر سائیکل چلانے کے نام پر چھیڑ آؤں۔ میں نے اُس کی کھڑکی کے پاس پہنچ کر انگوٹھا اور انگلی جوڑ کر چھلا بنایا۔ اور سیٹی بجائی۔ میری یہ سیٹی دوستوں میں بہت مشہور تھی۔ راجن کا سر کھڑکی میں نظر آیا۔ اُس کے ہاتھ میں چابیاں تھیں اور مارے خوشی کے باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ پھر وہ غائب ہو گیا اور ذرا دیر میں گیٹ پر نظر آیا۔ سر پر لال ہیلمٹ اور چمڑے کی پیلی جیکٹ پہنے' حالانکہ وہ اچھی خاصی گرم دوپہر تھی۔

ہلکے ہلکے بنا کوئی آواز کیے اُس نے موٹر سائیکل گیٹ سے باہر نکالی۔ وہ گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتا جاتا تھا۔ یہ بات اور ہے کہ بھاری ہیلمٹ کی وجہ سے اُس کی گردن اکڑ گئی تھی۔ اور اُسے اِدھر اُدھر دیکھنے کے لئے بڑی محنت سے اپنا پورا جسم گھمانا پڑتا تھا۔ سڑک پر لا کر وہ آہستہ آہستہ اُسے دھکیلتا ہوا دو تین مکان آگے لے گیا۔ کود کر گدی بیٹھا۔ چابی اگنیشن میں لگائی پٹرول کھولا' اور زور

سے کک ماری۔ اور گھوں گھوں کر کے انجن جاگ اٹھا۔ اُس نے اکڑے اکڑے مڑ کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں خوشی اور جوش سے کانپتا کپکپاتا اُس کے پیچھے بیٹھ تو گیا' پھر بھی مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ موٹر سائیکل چلا پائے گا۔" تیار ہو؟" راجن نے انجن کی گھڑ گھڑاہٹ میں چلا کر پوچھا" ہاں دیر کس بات کی ہے۔" اور ہم چل پڑے۔ سڑک تقریباً خالی تھی۔ شروع شروع میں تھوڑے سی کود پھاند کے بعد موٹر سائیکل قابو میں آ گئی' اور ہم آرام سے چلنے لگے۔ نکڑ پر پہنچ کر ایک جھونک میں ہم سیدھے ہاتھ پر مڑے اور سیدھے کریسنٹ روڈ پر آ گئے۔ میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر آگے جھکا اور رفتار بتانے والے میٹر پر نظر ڈالی۔ 30 کلو میٹر فی گھنٹہ 40-60' واہ مزہ آ گیا۔

ہم لال بتی کے پاس پہنچ گئے تھے جو اَب پیلی ہو چکی تھی۔ مگر راجن کا رُکنے یا آہستہ ہونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بتی لال ہو چکی تھی۔ مگر راجن نے چوراہا پار کر لیا۔ مجھے پیچھے سے پولس کی سیٹی سنائی تو دی۔ مگر ڈر کے مارے مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہیں پڑی۔ ہم پوری رفتار سے دن دناتے ہوئے آگے نکل گئے اور مجھے راجن کا قہقہا سنائی دیا۔

راجن نے کریسنٹ روڈ پار کی اور اگلے موڑ پر مڑ گیا سامنے ایک بُوڑھیا آ گئی۔ راجن نے اُسے کچھ دیر سے دیکھا۔ اُس نے بریک پر پیر رکھا۔ اچانک بریک لگنے سے موٹر سائیکل سے چیخ جیسی آواز نکلی۔ اوہ وہ رُک گئی۔

میں نے دیکھا کہ بڑھیا منہ کے بَل سڑک پر گر پڑی ہے میں گھبرا گیا بُوڑھیا کے تھیلے میں بھرے پیاز آلو اور ٹماٹر چاروں طرف بکھرے پڑے تھے۔ راجن ڈر گیا۔ اُس نے اچانک اسپیڈ دی۔ اور ہم وہاں سے بھاگ لیے۔ مجھے دو چار منٹ بعد اُس کا احساس ہوا۔

"رو کو راجن' میں اُس کے کندھے پکڑ کر چلایا"

اُس نے کندھے جھٹک کر میرے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ "پاگل ہوا! میں جیل نہیں جانا چاہتا!"

"مگر وہ عورت......!"

"ٹھیک ہے وہ...... اُسے کوئی خاص چوٹ نہیں آئی۔"

مجھے غصہ آگیا اور میں نے کہا "ہمیں رک کر اُس کی مدد کرنی چاہئے۔ ایسے مار کر بھاگ جانا کتنے کمینے پن کی بات ہے!"

مگر راجن لاپروائی سے موٹر سائیکل بھگاتا رہا۔

مجھے اور زیادہ غصہ آنے لگا۔ ہم لوگ اکسیڈینٹ کی جگہ سے کوئی دو کلو میٹر دور آگئے ہوں گے۔ آخر میں نے زبردستی راجن کو رکنے کے لیے مجبور کر ہی دیا۔

"میں واپس جا رہا ہوں۔" میں نے موٹر سائیکل سے اُترتے ہوئے کہا۔ مجھے غصے کے ساتھ ڈر بھی لگ رہا تھا۔ اور غلطی کرنے کا احساس بھی تھا۔

"جو دل چاہے کرو۔ مگر مجھے اس جھنجھٹ میں مت پھنساؤ!" راجن کے لہجے میں بہت کڑواہٹ تھی۔

"تم بچھورے ہو۔ ڈرپوک ہو۔!" میں چلایا اور مڑ کر سڑک کے پار بس اسٹاپ کی طرف جھپٹا۔ جلدی سے بس میں چڑھ گیا۔ میرے چڑھتے ہی بس چل پڑی۔ جب کنڈیکٹر میرے پاس آیا۔ تو پتہ چلا کہ میرے پاس پیسے تو ہیں ہی نہیں۔

"سوری۔ میں کل آپ کو پیسے دے دوں گا۔ مگر مجھے بہت ضروری کام سے کریسنٹ روڈ پر پہنچنا۔"

"اترو!" کنڈکٹر نے مجھے جھڑک دیا۔ اس نے بس کی چھت پر زور سے ہاتھ مارا۔ اور بس رُک گئی۔ "تم بڑے ڈھیٹ ہو جو بنا پیسوں کے بس میں چڑھ آئے۔ اترو۔" "پلیز' وہاں ایک ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میرا وہاں پہنچنا بہت ضروری ہے۔" میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"چپ چاپ نیچے اتر جاؤ۔" اب کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر میں خود نیچے نہیں اترتا تو وہ مجھے اٹھا کر باہر پھینک دیتا۔ تبھی ایک بوڑھی عورت نے میری مدد کی۔ اُس نے اپنا پرس کھولتے ہوئے کہا۔ "بے چارہ پریشان معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے خوشی اور احسان کے جذبہ کے ساتھ اُس کا شکریہ ادا کیا۔ شرم سے میرا منہ لال ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے بس نے نہ نے جانے کتنی دیر لگا دی ہو کریسنٹ روڈ پہنچنے میں۔ وہاں بھیڑ جمع تھی۔ ایک نوجوان نے بُڑھیا کے ہاتھ پر پٹی باندھ دی تھی۔ اور وہ آٹو رکشا میں بیٹھنے میں اُس کی مدد کر رہا تھا۔

"نیلی موٹر سائیکل تھی۔" کسی نے کہا۔ "دو لڑکے بیٹھے تھے اُس پر۔ بدمعاش اُن کو کوڑے مارنے چاہئیں۔ کوڑے۔" پولس آفیسر نے کہا۔ اور لوگوں کی بھنبھناہٹ کے شور میں کچھ اونچی آواز سے پوچھا۔ "کسی نے نمبر نوٹ کیا؟"

میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔ "سر میں بتاتا ہوں...... دیکھیے وہ ایسا تھا کہ میں اُس موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھا تھا............"

'ڈوں...... 'میں نے مڑ کر دیکھا۔ تو نیلی موٹر سائیکل بھیڑ کے پاس آکر رُک گئی تھی اور راجن اُس پر سے اُتر رہا تھا۔ اُس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے دیکھا۔ اَب اُس کی آنکھوں میں ایمان داری کی چمک تھی۔ "میں بتاتا ہوں...... یہ سب میری غلطی سے ہوا ہے!" اُس نے آگے بڑھ کر پولس افسر سے کہا۔ "میں نے ایک لمبی سانس لی اور آگے بڑھ کر راجن کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا۔ کندھے سے کندھا ملائے۔"

پڑوسی

بھیڑ سڑک پر بڑھی چلی آرہی تھی۔ غصے سے پاگل لوگوں کا یہ گروہ، چیختا چنگھاڑتا، اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کو ٹھوکریں مارتا بڑھا چلا آرہا تھا۔ لوگ چلا رہے تھے۔ پکڑلو ان سب کو۔ ان بزدلوں کو اپنے خون سے قیمت چکانی ہوگی۔ اُن میں سے بہت سے لوگ نشے میں تھے۔ کچھ کو تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کررہے ہیں۔

بچّی نے اپنے گھر کی طرف آتی ہوئی اُن کی آوازیں سنیں۔ وہ سہم گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کا بوڑھا دادا اُسے نہیں بچا سکتا۔ کوئی اُن کی مدد کرنے والا نہیں۔ کوئی نہیں سوائے اوپر والے کے۔ اُس نے سوچا، اور آنکھیں بند کر کے دُعا مانگنے لگی۔ مگر دُعا کے جو الفاظ اُسے یاد تھے اب دماغ میں نہیں آرہے تھے۔

اُس نے دھیمی سی آواز میں پکارا۔ "دادا"

بوڑھے دادا اُس کی طرف مُڑے۔ گھپ اندھیرے کمرے میں وہ اُن کا چہرہ تو نہیں دیکھ سکی لیکن ٹٹول کر اُن کے ہاتھ کو چھوا۔ اُنھوں نے اُس کے ننھے سے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ جیسے اُس کی ہمت بندھا رہے ہوں۔ پھر اُنھوں نے اُسے اپنی طرف کھینچ کر اُس کے ننھے سے کندھوں کو اپنے کمزور بازوؤں میں دبالیا اور اُس کی حفاظت کا یقین دلانے کی کوشش کی۔

"گھبراؤ نہیں بٹیا رانی" دادا نے بھی آہستہ سے جواب دیا۔ "اوپر والا ہمارے ساتھ ہے۔ سب کچھ اُس کی مرضی سے ہوتا ہے۔"

بچّی کو ڈر کے مارے گلے میں کچھ پھنستا سا محسوس ہوا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُس نے ایک سسکاری کے ساتھ کہا۔

"دادا یہ تو غلط بات ہے۔ بڑی ناانصافی کی بات ہے۔ وہ ہمیں کیوں مارنا چاہتے ہیں!؟ ہم نے تو

اُن کا کچھ نہیں بگاڑا۔ شہر کے دوسرے سرے پر جو کچھ ہوا ہم تو اُس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ وہ ہمیں کیوں نقصان پہنچائیں گے۔ ہم تو اُن کے پڑوسی ہیں' دوست ہیں۔"

بوڑھے دادا نے ایک لمبی آہ کے ساتھ کہا۔ "آج رات سڑکوں پر نکلے ہوئے یہ لوگ نہ ہمارے پڑوسی ہیں نہ دوست۔ یہ تو پاگل ہیں۔ اپنے سماج' اپنی قوم یا حکومت کے خلاف اپنی ذاتی پریشانیوں اور شکایتوں سے جھنجھلا کر جنون میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ یہی لوگ لوٹ مار' قتل و غارت گری اور فساد شروع کرتے ہیں۔ آج ان کا شکار ہم ہیں کل کوئی اور ہوگا۔"

"مگر دادا یہ لوگ...... یہ لوگ......"

دادا نے بچّی کو اپنے کندھے سے لگا کر پیار سے دلاسا دیا...... "گھبراؤ نہیں ہو سکتا ہے یہ لوگ ہمارے گھر سے آگے نکل جائیں۔" دھڑکتے دل سے بچّی نے رات کے سناٹے میں کچھ سننے کی کوشش کی۔ بھیڑ پاس آتی جا رہی تھی۔ وہ اُن کے گھر کی طرف ہی بڑھ رہے تھے۔ سادا سا سیمنٹ کا مکان جو دونوں طرف سے مٹ میلی' بالکل ایک جیسی عمارتوں سے گھرا ہوا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے گیٹ اور گھر کے بڑے دروازے کے بیچ میں ایک چھوٹا سا گھاس کا ٹکڑا تھا۔ چار دیواری کے ساتھ ساتھ گلابی اور پیلے 'گلاڈیولا' کے پودے لگے تھے۔ جنہیں بڑی نفاست کے سے چھوٹی چھوٹی لکڑیوں سے باندھ دیا گیا تھا۔ اُن کے پڑوسی کے اٹھارہ سال کے بیٹے 'ٹوٹو' نے اسے ان پودوں کی گانٹھیں دی تھیں اور پھولوں کی باغبانی کے گُر بتائے تھے۔ ٹوٹو اُسے اچھا بھی لگتا تھا اور وہ اُسے بہت پسند کرتی تھی۔ کاش ٹوٹو اس وقت یہاں ہوتا۔ وہ ضرور ان کی مدد کرتا۔ کچھ بھی ہو وہ انہیں مرنے نہیں دیتا۔

اُس نے آہستہ سے کہا...... "دادا ہم ٹوٹو کو بلا لیں وہ......"

"ش ش ش............ بٹیا رانی چپ رہو۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ اپنا منہ ہاتھوں میں چھپا کر ٹوٹے ٹوٹے جملوں میں آہستہ آہستہ دُعا کرنے لگی۔ "اے اوپر والے۔ یہ لوگ ہمارے گھر سے آگے بڑھ جائیں۔ کہیں دور چلے جائیں۔ اگر آج تو نے ہماری مدد کر دی تو میں وعدہ کرتی ہوں...... پکا وعدہ...... کبھی جھوٹ نہیں بولوں گی...... کبھی جھگڑا

نہیں کروں گی...... بہت اچھی لڑکی بن جاؤں گی...... میں وعدہ کرتی ہوں...... پر اُس وقت ہماری مدد کر...... یہ لوگ آگے نکل جائیں یہاں سے......"

مگر بھیڑ آگے نہیں نکلی...... وہ بوڑھے کے گھر کے سامنے رُک گئی۔ ایک آدمی نے ٹھوکر ماری۔ گیٹ کھل گیا۔ وہ دروازے کی طرف جھپٹا...... وہ کوئی تیس آدمی ہوں گے۔ لاٹھیوں کلہاڑیوں اور لوہے کی چھڑوں سے لیس۔ دروازے پر لاٹھیاں برساتے ہوئے وہ چلائے۔ "کھولو' بزدل' کمینو! دروازہ کھولو' ورنہ ہم توڑ کر اندر گھس آئیں گے۔"

گھر کے آخری حصّے میں' صدر دروازے سے دور' اندھیرے گھپ چھوٹے سے بیڈ روم میں سہمی ہوئی بچّی خوف سے کانپ گئی۔ "دادا...... دادا...... کچھ کیجئے...... وہ لوگ آرہے ہیں...... وہ دروازہ توڑ رہے ہیں۔" اُس نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔

"چھپ جا بٹیا رانی چھپ جا۔" دادا نے کہا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر لڑکھڑاتے ہوئے کھڑے ہوگئے۔ "چھپ جا کہیں...... کہیں بھی...... پلنگ کے نیچے...... دروازے کے پیچھے...... اوپر والے...... او اوپر والے! ہم کہاں چھپیں......" ڈر' گھبراہٹ اور بے بسی میں وہ اپنے جانے بوجھے کمرے میں بھی اِدھر اُدھر چکرانے لگے۔

"دادا...... دادا......!" بچّی سرگوشی کے سے انداز میں چیخی۔ "یہاں الماری کے پیچھے آجایئے۔ جلدی آیئے ورنہ وہ دیکھ لیں گے"

"بٹیا رانی...... " اندھیرے میں اِدھر اُدھر ٹٹولتے ہوئے بوڑھے دادا بے بسی سے چلائے......

آنکھ جھپکتے ہی بچّی دوڑ کر اُن کے پاس پہنچ گئی اور اُن کا ہاتھ پکڑ کر الماری کی طرف لے آئی۔ دادا کو دیوار اور الماری کے بیچ دھکیل کر وہ خود بھی تیزی سے وہیں گھس گئی۔ اُس کی نگاہیں دروازے پر ٹکی رہیں۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اُس نے پھر دُعا کی۔ "اوپر والے اس وقت ہماری مدد کردے......" اپنے پیچھے سے اُسے دادا کی تیز تیز سانسوں کی آواز سنائی دی۔ پھر اُنہیں کھانسی آگئی۔ تیز' سوکھی آواز۔ دھوں' دھوں'۔

"دادا! اس وقت مت کھانسیے۔ پلیز...... وہ لوگ ہمیں ڈھونڈ لیں گے...... وہ گھگھیائی۔"
"ٹھیک ہے ٹھیک ہے!" بوڑھے نے اپنی کھانسی کے دورے کو روکنے کی پوری کوشش کی۔
دروازے پر جمع بھیڑ کا وحشیانہ شور پھر اُٹھا۔ ڈر کے مارے لڑکی کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈی ٹھنڈی لہریں سی دوڑتی محسوس ہوئیں۔ سانس روک کر اُس نے آوازوں پر کان لگا دیے۔ دروازے پر لوہے کی چھڑیں پڑنے کی آوازیں برابر سُنائی دے رہی تھیں۔
آخر دروازے کے پٹ جھٹکے سے کھل ہی گئے اور بڑے زور سے دیواروں سے ٹکرائے۔ بھیڑ ڈرائنگ روم میں گھس آئی اور چھوٹا سا مکان جیسے لرز کر رہ گیا۔ لوگ دیوانوں کی طرح جس چیز پر نظر پڑی اُسے توڑنے لگے۔ وہ چیخ رہے تھے۔ "پکڑلو ان بزدلوں کو 'ڈرپوک کہیں کے...... پکڑلو...... پکڑلو......"
اب سب آوازوں میں نفرت سے بھری ایک آواز سب سے اوپر اور صاف سُنائی دے رہی تھی۔ "باہر نکلو! غدارو!...... باہر آؤ اُس سے پہلے کہ ہم خود تمہیں پکڑلیں......"
لڑکی کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے جیسے رُک سی گئی۔ دم حلق میں آگیا...... وہ سکڑ کر دادا سے اور چمٹ گئی۔ ...... نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا...... ہرگز نہیں۔ ! یہ سچ نہیں ہے......! اُس آواز کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ کل ہی تو اس آواز نے اُس سے کہا تھا...... "میری ننھی منی شہزادی۔! تمہارے 'ڈھلیا' کے پھول تو میرے پھولوں سے بھی بڑے ہیں۔ اگلے ہفتے ہمارے 'سُتا پھول' کے پودے تیار ہو جائیں گے جی چاہے تو اُن میں سے کچھ لے لینا۔" وہ آواز کتنی میٹھی تھی کتنی گرم جوشی تھی اُس میں...... کتنی محبت اور اپنائیت تھی اُس ہاتھ میں جو اُس نے میرے سر پر پھیرا تھا۔ مگر آج اُسی آواز میں کتنی سفاکی ہے' کتنی بے رحم ہے یہ آواز...... یہ ٹوٹو کی ہی آواز ہے۔ اُن کے پڑوسی کا بیٹا ٹوٹو...... اُس کا دوست ٹوٹو...... دادا ٹھیک ہی کہتے تھے' بالکل صحیح کہا تھا اُنہوں نے...... پڑوسی دشمن بن گئے ہیں...... جانی دشمن...... اور اب وہ ہمیں مار ڈالنے کے لیے یہاں موجود ہیں۔
خوف' دہشت اور مایوسی سے وہ پتھرا سی گئی۔ اُسے احساس تھا کہ اب وہ ہار چکی ہے...... اب کوئی نہیں جو اُن کی مدد کرے...... کوئی نہیں جس کا سہارا ہو...... دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر وہ دُعا کرنے لگی۔

اُس رات میں پہلی بار وہ تہہِ دل سے دُعا کر رہی تھی۔ الفاظ اپنے آپ اُس کے ہونٹوں پر آ رہے تھے۔

"کمرے میں ڈھونڈو۔" اُس آواز نے کہا۔ "اُس وقت ان لوگوں کو گھر پر ہی ہونا چاہیے...... کہیں چھپ گئے ہوں گے...... زہریلے ناگ...... پر ہم اُن کو ڈھونڈ لیں گے۔"

آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ بیڈ روم کی طرف۔ لات مار کر دروازہ کھولا گیا اور ڈرائنگ روم سے آنے والی روشنی میں دروازے پر ایک لمبے سے جوان آدمی کا ہیولہ نظر آیا۔ یہ ٹوٹو تھا...... پڑوسی کا بیٹا۔ اُس نے ٹارچ جلائی اور اُس کی روشنی اندھیرے کمرے میں ادھر اُدھر گھومنے لگی۔ ٹارچ کی روشنی کا دائرہ فرش پر رینگتا ہوا پلنگ کے نیچے گیا پھر وہاں سے دیوار پر لہراتا ہوا کھڑکی کی طرف بڑھ

گیا۔ ٹارچ کی روشنی پردے پر پڑی پھر آگے بڑھ گئی۔ نوجوان نے ایک قدم آگے بڑھایا' ٹھٹکا پھر ایک قدم اور آگے بڑھا۔ وہ خاموش تھا مگر لڑکی کو اُس کی بھاری بھاری سانسیں صاف سُنائی دے رہی تھیں کیونکہ وہ آہستہ آہستہ قریب آتا جارہا تھا۔

لڑکی نے محسوس کیا کہ دادا کھانسی دبانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ "نہیں دادا اِس وقت نہیں...... اُس وقت نہیں۔"

بوڑھے نے منہ پر ہاتھ رکھ کر کھانسی کو دبانے کی بہت کوشش کی...... مگر...... بیکار...... نوجوان نے سُن لیا۔ وہ جھٹکے سے گھوما اور ٹارچ کی روشنی بوڑھے کے چہرے پر پڑی۔ اچانک اور تیز روشنی سے چوندھیا کر کھانستے ہوئے بوڑھے نے اپنے بازوں سے چہرہ چھپالیا۔ سہمی سکڑی لڑکی حیرت سے نوجوان کو دیکھنے لگی۔

اُس کے منہ سے بہت آہستہ سے نکلا "ٹوٹو" اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یکا یک وہ الماری کے پیچھے سے نکلی اور دیوانوں کی طرح نوجوان کے سینے پر اپنے ننھے منے ہاتھوں سے گھونسے برسانے لگی۔ "چھوڑ دو میرے دادا جی کو چھوڑ دو۔"

ایک جھٹکے میں نوجوان نے لڑکی کو پکڑ لیا۔ ایک ہاتھ سے اُس کا منہ کس کر دبالیا اور ادھر اُدھر پڑے سامان پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ اُس نے پلنگ اُلٹ دیا پاس رکھا لیمپ توڑ دیا۔ یہ آوازیں سن کر دو لوگ دروازے پر آگئے۔

"کیا ہو رہا ہے" ایک آدمی کی گرج دار آواز آئی۔ "کیا تم نے پکڑ لیا ان کو؟......" لڑکی کی سانس جیسے رُک سی گئی وہ نوجوان کی گرفت میں بے جان سی ہو گئی۔ دروازے کی طرف پیٹھ کر کے ٹوٹو چلایا۔

"یہاں کوئی نہیں ہے۔ اوپر جاؤ۔ شاید وہ اوپر چھپے ہیں' بزدل کہیں کے۔" ایک بکسا کھڑکھڑاتا ہوا اُن کی طرف آیا اور وہ دونوں مُڑ کر اوپر کی طرف بھاگے۔

اُن دونوں کے جاتے ہیں نوجوان نے اپنی گرفت ڈھیلی کی اور آہستہ سے کہا "دھیان سے میری بات سنو شہزادی۔ تم یہاں سے جتنی جلدی ہو سکے نکل جاؤ۔ کھڑکی سے کود کر پچھلے دروازے

سے...... پیچھے گلی میں...... جلدی کرو...... میری ماں تمہارا انتظار کر رہی ہیں...... ہمارے گھر کا پچھلا دروازہ کھلا ہے۔"

"ٹوٹو!......اُف......ٹوٹو...... پر تم............ تم......!اور دادا کا کیا ہوگا؟"

"اُن کی فکر مت کرو' میں جو ہوں۔" نوجوان نے سمجھایا اور اُسے کھڑکی پر چڑھاتے ہوئے کہا۔ "بھاگو جلدی۔ اپنی جان بچاؤ۔"

پلک جھپکتے ہی لڑکی نیچے زمین پر کودی اور پل بھر میں پچھلے دروازے پر پہنچ گئی۔ دروازہ کھول کر وہ پچھلی گلی میں آ گئی۔ پیچھے گھر میں سے بھیڑ کا شور اور توڑ پھوڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اندھیرے میں ٹھٹک کر رُک گئی۔ 'دادا کا کیا ہوگا؟' کیا وہ اُنہیں ایسے ہی چھوڑ کر جا سکتی ہے؟ اُسے ٹوٹو کے الفاظ یاد آئے "بھاگو۔ اپنی جان بچا کر بھاگو۔"

وہ بھاگتی رہی۔ کوڑے کرکٹ سے اُلجھتی گرتی پڑتی۔ بھاگتی رہی۔ آخر اُسے ایک دروازے کی درازوں سے روشنی کی ہلکی سی کرن اندھیری گلی میں پڑتی دکھائی دی۔ کانپتے ہاتھوں سے اُس نے دروازہ کھولا پھولی ہوئی سانسوں اور ہچکیوں کے ساتھ وہ دروازے کے پیچھے کھڑی عورت کی باہوں میں جھول گئی۔ عورت نے لرزتی کانپتی لڑکی کو سینے سے لگا کر اُس کے کان میں کہا "اوپر والے کا شکر ہے تم بچ گئیں۔ ہم لوگ تم اور تمہارے دادا کے لیے بہت پریشان تھے۔ کیا وہ ٹوٹو کے ساتھ آ رہے ہیں؟"

"پتا نہیں" لڑکی نے دھیمے سے کہا اور رونے لگی۔

عورت نے پیار سے اُسے سینے سے لگایا اور کہا۔ "سب ٹھیک ہے۔ اب تو سب ٹھیک ہی ہے۔ ڈرنے کی اب کوئی بات نہیں۔ ہم یہیں اُن لوگوں کا انتظار کریں گے۔"

لڑکی کو کچھ پتا نہیں کتنی دیر اُس نے انتظار کیا۔ کتنی دیر وہ لوگ رات کے سناٹے کو چیرتی وہ آوازیں سُنتے رہے۔ شیشے ٹوٹنے' لکڑیاں چٹخنے کی آوازیں۔ نفرت اور تشدد بھرا شور۔ پھر آہستہ آہستہ آوازیں دم توڑنے لگیں۔ بھیڑ آگے بڑھ گئی۔ رات کا سناٹا پھر سے چھا گیا۔

لڑکی نے سوالیہ نظروں سے عورت کی طرف دیکھا۔ "ٹوٹو اب تک کیوں نہیں آیا؟" اُس کے

دادا کہاں ہیں؟

عورت مڑ کر آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ دروازہ بند کر کے کنڈی لگانے ہی والی تھی کہ اچانک کچھ سُن کر رُک گئی۔ سرگوشیوں اور قدموں کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ کچھ لوگ آرہے ہیں۔ لڑکی گھبرائی۔ کیا یہ وہ لوگ ہیں یا دادا اور ٹوٹو آرہے ہیں؟ پہلے تو اُس کی سانس رُک سی گئی مگر پھر وہ دراوزے کی طرف دوڑی اور دروازہ کھول کر اندھیری گلی میں جھانکنے لگی۔ دور اندھیرے میں اُسے دو لوگ آتے نظر آئے پھر اُن کی ہلکی ہلکی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔

"بس پہنچ گئے ہیں دادا۔ بس آہی گئے۔ آپ کا سب کچھ برباد ہو گیا مگر آپ تو زندہ ہیں۔"

"ہم سب زندہ ہیں۔ پیارے لڑکے" بوڑھے نے جواب دیا۔ "تم۔ وہ لڑکی۔ اور میں۔" اور پھر رات کے اندھیرے میں اُنہوں نے پکارا۔ "تم وہاں ہو نہ بٹیا رانی۔ تم ہو نہ وہاں؟"

انوکھے پودے

ریو تھی' موسیقی سیکھ رہی تھی۔ خالی وقت میں اُسے وائلن بجانے میں بہت مزہ آتا۔ اُس کے گھر کے سامنے ایک چھوٹا سا صحن تھا جس میں اک چھوٹی سی سیمنٹ کی بینچ بھی بنی ہوئی تھی۔ جس پر بیٹھ کر وہ وائلن کی مشق کرتی تھی۔ گملوں میں لگے پودے بھی صحن میں رکھے تھے۔ ایک دن وائلن بجاتے بجاتے اُس کی نظر دیوار کے پاس رکھے ایک گملے پر پڑی۔ جس میں گل مہندی کے پودے لگے ہوئے تھے۔ یہ پودے دیکھنے میں کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ اُن کی پتیوں کا ہرا رنگ کچھ پیلا پڑ گیا تھا اور اُن کی بڑھوار بھی کچھ رک سی گئی تھی۔ اُسے یاد آیا کہ اُس نے پہلے کبھی کسی کلاس میں پڑھا تھا کہ صحیح بڑھوار کے لئے پودوں کو روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُس نے گملے کو صحن کے بیچ میں ایسی جگہ رکھ دیا جہاں خوب دھوپ آتی تھی۔ پودے کی جگہ بدلتے وقت ریو تھی کو خیال آیا کہ کیوں نہ کالونی میں ہونے والے 'بہترین پودے کے مقابلے' میں حصہ لیا جائے۔ مقابلہ ہونے میں ابھی دو تین ہفتے باقی تھے۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ مقابلے میں ضرور حصہ لے گی۔ یہ فیصلہ کرتے ہی اُس نے اُسی وقت پودے کو پانی دیا اور بینچ پر بیٹھ کر وائلن بجانے لگی۔ اُسے راگ موہنم' بہت پسند تھا۔ کچھ دیر وہ راگ بجاتی رہی پھر پڑھنے کے لئے اندر چلی گئی۔

ہر روز کی طرح ایک دن شام کو اسکول سے واپس آنے کے بعد وہ اپنے پودوں کے پاس گئی۔ پودے بہت تر و تازہ اور صحت مند لگ رہے تھے۔ مگر اُس نے دیکھا کہ ایک پتی بس آدھی ہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی کیڑے نے آدھی کھالی ہو۔ ریو تھی پریشان ہو گئی۔ مقابلے میں دو چار دن ہی رہ گئے تھے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس وقت اُسے اپنے پودوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اُس نے غور سے پودوں کو دیکھا تو اُسے ایک شاخ پر ایک کیڑا رینگتا نظر آیا۔ اُس نے فوراً چھوٹی سی لکڑی سے کیڑے کو ہٹایا اور پودوں پر کیڑے مار دوا چھڑک دی۔ اُسے اطمینان ہو گیا کہ اب اُس کے پودے محفوظ ہیں۔

پھر وہ روزانہ بینچ پر بیٹھتی اور اپنے پودوں کو دیکھتی۔ وہ صحن کے دوسری طرف لگے پودوں سے زیادہ اچھے اور تر و تازہ لگتے تھے۔ ایک دن وائلن بجاتے بجاتے اُس نے دیکھا کہ گملے میں لگے پودوں میں کچھ حرکت ہو رہی ہے۔ وہ اپنے تنے ہلا ہلا کر اُس کی طرف جھک رہے ہیں۔ اُسے حیرت ہوئی کہ پودے کیوں ہل رہے ہیں جب کہ اُس وقت ہوا بھی نہیں چل رہی ہے۔ اُسے کچھ عجیب سا لگا۔

اگلے دن شام کو اُس نے ہمیشہ کی طرح وائلن بجایا اور پودوں کو دھیان سے دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد پودے اُسی طرح ہلنے لگے۔ جیسے پچھلے دن ہل رہے تھے۔ اُسے اُن کا اپنی طرف بار بار جھکنا دکھائی دے رہا تھا۔ اُسے بہت حیرت ہوئی کیونکہ اُس دن بھی ہوا نہیں چل رہی تھی۔

ریو تھی بینچ پر بیٹھ گئی۔ اور وائلن پر تیز لے کی دوسری دُھن بجانے لگی۔ اچانک اُس نے دیکھا سارے پودے دوسری طرف مڑ گئے۔ جیسے انھیں یہ دُھن اچھی نہ لگی ہو۔ اُس نے پھر اپنی وہی پرانی خاص دُھن بجائی۔ اور پودے سیدھے ہو کر اُس کی طرف جھکنے لگے۔ اب اُس کا خیال یقین میں بدل گیا کہ اُس کے پودوں کو اُس کی پسندیدہ دھن اچھی لگتی ہے۔

یہ بات اُس نے کسی کو نہیں بتائی۔ کسی کو بھی نہیں اپنی ماں تک کو بھی نہیں۔ مقابلے کے بس دو چار دن رہ گئے تھے۔ اُسے یہ دیکھ کر بھی حیرانی ہوئی کہ اُس کے پودے نہ صرف دوسرے گل مہندی کے پودوں سے بڑے اور صحت مند تھے بلکہ اُن میں دوسرے پودوں سے پہلے پھول بھی کھل گئے تھے۔ بہت ہی بڑے اور کھلے ہوئے رنگ کے پھول تھے۔ اور ایک پودے کے پھول تو بالکل ہی نئی قسم کے تھے۔ بنفشی رنگ کے پھول پر سفید دھاریاں پڑی ہوئی تھیں۔ اب اُسے یقین تھا کہ اُسے سب سے اچھے پودے کا انعام ضرور ملے گا۔ وہ سونے چلی گئی۔ اور رات بھر خواب میں اپنے پودوں اور اُس نئی قسم کے پودوں کو دیکھتی رہی۔ آنے والا دن وہی خاص دن تھا۔ جس کا اُسے انتظار تھا۔

اگلے دن وہ صبح سویرے اٹھتے ہی سیدھی صحن میں پودوں کو دیکھنے پہنچ گئی۔ تھوڑی دیر وہ آنکھیں جھپکائے دیکھتی رہی۔ کیونکہ وہاں نہ گملے تھے نہ پودے۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ شاید کسی نے ہٹا کر کہیں اور رکھ دیئے ہوں۔ سب جگہ ڈھونڈا۔ اپنی ماں سے پوچھا۔ اُنھوں نے کہا اُنھیں نہ گملوں

کی کوئی خبر ہے نہ پودوں کی۔ ہاں کل دوپہر میں کچھ پڑوسی ضرور آئے تھے۔ جو ان ترو تازہ پودوں اور خوبصورت پھولوں کی بہت تعریف کرر ہے تھے۔ مگر اُس کے بعد وہ اندر گھر میں لگ گئیں۔ اور دوبارہ صحن میں نہیں جاپائیں۔ ریو تھی کو بے حد دُکھ ہوا وہ محلے بھر میں ہر ایک سے پوچھتی پھری۔ مگر کوئی گملوں کے پاس بھی نہیں آیا تھا وہ اپنے معمولی گملوں کے لئے پولس سے بھی شکایت نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کا سب کچھ گم ہو گیا ہو۔ اُسے انعام کا بھی اتنا غم نہیں تھا۔ مگر اپنے پودے اُسے بہت یاد آرہے تھے۔ آج اُسے لگا وہ اپنے پودوں سے کتنا پیار کرنے لگی تھی۔ وہ اُس کے دوست تھے اُس کی موسیقی کا مزہ لینے والے دوست۔

شام کو اُس کے سب دوست تقسیم انعامات کے جلسے میں جارہے تھے۔ مگر اُس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہاں جائے پھر بھی اُس کے دوستوں نے جب بہت ضد کی تو وہ راضی ہو گئی۔ وہاں پہنچ کر وہ سیدھی اُس طرف چلی گئی جہاں بہت سے گملوں میں لگے پودے رکھے تھے۔ ریو تھی حیران رہ گئی سامنے بینچ پر اُس کا گملا بھی رکھا ہوا تھا۔ اور اُس کی مٹی میں چھوٹے سے کارڈ پر مقابلے میں حصہ لینے والے کا جو نام لکھا تھا وہ اُس کے گھر سے کافی دور رہنے والے ایک پڑوسی کا تھا۔ وہ اچھی طرح پہچان گئی کہ یہ اُسی کا پودا ہے۔ وہ سیدھے مقابلہ کا انتظام کرنے والوں کے پاس گئی اور انھیں ساری بات بتائی۔

اُن لوگو کو یقین نہیں آیا۔ اُنھوں نے کہا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟ جن صاحبہ نے یہ پودا مقابلے میں شامل کیا ہے وہ تو ہر سال مقابلے میں حصہ لیتی ہیں۔ ہم اُن پر کیسے شک کر سکتے ہیں۔ ریو تھی سوچ میں پڑ گئی کہ اُن لوگوں کو کیسے اپنی بات کا یقین دلائے۔ کچھ دیر وہیں بیٹھ کر پودوں کو دیکھنے لگی۔ اور پھر یکایک اُس کے دماغ میں وہ تصویر گھومنے لگی۔ جب وہ وائلن بجاتی تھی اور پودے اُس کی طرف جھک کر جھومنے لگتے تھے۔ اُس نے مقابلے کا انتظام کرنے والوں سے کہا۔ میں ثابت کر سکتی ہوں کہ یہ میرے ہی پودے ہیں۔ پھر اُس نے سیدھی اپنے گھر کی طرف دوڑ لگادی۔ اور ذرا سی دیر میں جب وہ اپنا وائلن لے کر لوٹی تو سب لوگ اُسے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ اُس وقت اُسے کسی کی مذاق اڑانے کی پرواہ نہیں تھی۔ ریو تھی نے اُن سے کہا۔ میں اپنے پودوں کو خوب پہچانتی ہوں اور ہمارے درمیان ایک راز کی

بات بھی ہے۔ میرے پودے بھی میری طرح موسیقی کے شوقین ہیں۔ آپ لوگ دیکھئے کہ جب میں وائلن بجاؤں گی تو وہ کیسے اپنی خوشی کا اظہار کریں گے۔

سب لوگ اور زور سے ہنسنے لگے۔ اُنھوں نے کہا کہ ہم نے تو آج تک نہیں سنا کہ پودے بھی موسیقی کے شوقین ہوتے ہیں۔ سب نے پوچھا کہ کیا پودوں کے بھی ہماری طرح کان ہوتے ہیں جو وہ تمھاری موسیقی سن سکیں گے ؟ کسی کو اُس کی بات پر یقین نہیں تھا۔

ریوتھی کو یہ باتیں بری تو بہت لگیں، مگر اُس نے طے کرلیا کہ وہ اپنے پودے واپس ضرور لے گی۔ وہ پودوں کے پاس بیٹھ گئی۔ اور آہستہ آہستہ اپنا پسندیدہ راگ بجانا شروع کیا۔ اپنی ذھن میں

مگن ہو کر کچھ دیر کے لئے وہ اپنے پودوں کو بھی بھول ہی گئی۔ مگر باقی لوگ تو دیکھ ہی رہے تھے۔ حیرت سے اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اُنھوں نے دیکھا کہ پودے پہلے کچھ سیدھے ہوئے اور پھر ریوتی کی طرف تھوڑے سے جھکے۔ ریو تھی وائلن بجاتی رہی' پودوں کے تنے اُس کی طرف ایسے جھک گئے جیسے وہ خوشی کے مارے ریو تھی کو چھونا چاہتے ہوں۔ مقابلے کا انتظام کرنے والے حیرت سے بت بنے ہوئے تھے۔ قدرت کا یہ کرشمہ اُن سب نے پہلی بار دیکھا تھا کہ پودے موسیقی پر جھوم رہے تھے اور اتنی بڑی ایجاد کا سہرہ ریو تھی کے سر تھا۔ اُن سب نے اُس کی تعریف کی اور کہا کہ ہمیں یقین ہے کہ یہ پودے تمھارے ہی ہیں۔ سب لوگ اُس کی پڑوسن کے پیچھے پڑ گئے۔ اور اُس کی خوب کھنچائی کی۔ آخر اُس نے قبول ہی کر لیا کہ اُس نے ریو تھی کے پودے چرائے تھے۔ اُس نے بتایا کہ ریو تھی کے گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے اُس کو یہ پودے نظر آئے اور اُس نے رات کو چپ چاپ انھیں چرا کر اپنے گھر رکھ لیا تھا اور پھر مقابلے کے لئے جمع کر دیا۔ کیونکہ وہ ہر سال مقابلے میں حصہ لیتی تھی اس لئے کسی کو کوئی شک بھی نہیں ہوا۔

مقابلے کے ججوں نے فیصلہ کیا کہ پہلا انعام ریو تھی کے پودوں کو ہی ملنا چاہیے کیونکہ وہ سب سے زیادہ صحت مند اور خوبصورت ہیں۔ ریو تھی انعام اور اپنے پودے لے کر بڑے فخر کے ساتھ اپنے گھر آئی۔

ہمت جیت کا راز

زندگی ٹبلبلا ہے پانی کا
بھاری پتھر کی طرح دو چیزیں
اِک مصیبت زدوں سے ہمدردی
دوسری ہمت وجواں مردی

"تم نے تازہ خبر سنی؟ ہماری کلاس میں ایک نیا لڑکا آیا ہے" نکو کپور نے صبح کی پرارتھنا کے لئے اسمبلی ہال میں داخل ہونے والے اپنے دوستوں کو بتا کر بتایا۔

"بکواس" سُریش نے فوراً ہی اعلان کر دیا۔

"کیا سچ کہہ رہے ہو؟ سال کے بیچ میں تو سر کسی کو داخلہ نہیں دیتے تمھیں معلوم ہی ہے" آٹھویں کلاس کے کپتان آنند نے یاد دلایا۔

"ہاں یہ تو ان کا پکا اصول ہے۔" رَوی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "نہیں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے خود سُنا ہے کھوسٹ روڈی حساب کے ٹیچر کو بتا رہے تھے۔ نکو نے اپنے کلاس ٹیچر مسٹر رودرا کے نام کو بگاڑ کر ان کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

"کاش وہ کھیل میں اچھا ہو۔" روی نے کہا۔ ان کے سب دوست بھی یہی تمنا رکھتے تھے۔ کیونکہ آٹھویں کلاس فٹ بال کے انٹر کلاس مقابلے میں اب تک ہوئے میچوں میں پچھڑی ہوئی تھی۔

"ضروری تو نہیں نیا لڑکا کھیل میں بھی دلچسپی رکھتا ہو' ہر لڑکے کو خواہ مخواہ دوڑنا بھاگنا' پسینے بہانا' اور گندا ہونا اچھا نہیں لگتا۔" نکو نے منہ بنا کر حقارت سے کہا۔

سب لڑکے منہ پھیر کر مسکرائے۔ سب جانتے تھے جسمانی محنت مشقت سے نکو کا دم نکلتا

ہے۔وہ کلاس کا سب سے شمپ لڑکا ہے۔ سُریش نے نکو کا ساتھ دیا" ہو سکتا ہے نکو ٹھیک کہہ رہا ہو نیا لڑکا کھیل میں واقعی شمپ ہو۔"

سب لڑکے یہ بھی جانتے تھے کہ سُریش چاہتا ہے کہ اُسے اسکول کی فٹ بال ٹیم میں شامل کرلیا جائے۔اس لئے وہ ابھی سے جلنے لگا ہے۔ جبکہ ابھی تو جلن کی کوئی بات تھی نہیں۔

صبح کی پرارتھنا کے بعد آٹھویں کلاس کے لڑکے اپنی کلاس میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر سب کو بڑی حیرت ہوئی کہ مسٹر رودرا پہلے سے ہی اپنی میز پر موجود تھے۔

"گڈ مارننگ سر" ان سب نے کورس میں کہا۔

"گڈ مارننگ" مسٹر رودرا نے مُسکرا کر جواب دیا" آج کچھ لوگ کلاس میں آنے والے ہیں اُن کے آنے تک میرا خیال ہے ہسٹری کا ٹیسٹ لے لیا جائے۔"

لڑکوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سر ہلائے 'وہ سب سمجھ گئے کون آنے والا ہے۔ مگر جب دس منٹ بعد ہیڈ ماسٹر صاحب کے ساتھ ایک دُبلا پتلا لڑکا کلاس میں داخل ہوا تو پوری کلاس میں ایک بھنبھناہٹ سی گونج گئی۔

"گڈ مارننگ" ہیڈ ماسٹر صاحب نے ان کی "گڈ مارننگ" کے جواب میں کہا۔ "بچوّں یہ چندر کانت گپتا ہیں۔ ہمارے 'پائن ہائٹس' کے نئے طالب علم۔امید ہے آپ ان کا سواگت کریں گے۔" ہیڈ ماسٹر صاحب نے تھوڑی دیر مسٹر رودرا سے بات کی اور پھر چندر کانت گپتا کو اشارہ کیا کہ وہ کلاس میں اپنی جگہ پر بیٹھ جائے۔

چندر کانت گپتا گھبرایا گھبرایا سب سے پہلی لائن میں ایک خالی ڈیسک پر بیٹھ گیا۔ "کھوسٹ روڈی کی بالکل ناک کے نیچے۔" کیونکہ لڑکوں کی پسندیدہ پچھلی لائن کی ساری جگہیں پہلے ہی جھپٹ لی گئی تھیں۔ہیڈ ماسٹر صاحب مطمئن ہو کر سر ہلاتے چلے گئے۔

"ہم لوگ ابھی ایک چھوٹا سا ہسٹری کوئیز کر رہے تھے۔ مجھے معلوم ہے اس وقت سب لڑکے کلاس میں نئے آنے والے کے بارے میں اندازہ لگانے میں مصروف ہوں گے۔ اور کسی طرح

کی کوئی سنجیدہ بات اس وقت سننا اور سمجھنا مشکل ہے۔" مسٹر رودرا نے مسکراتے ہوئے ایسے کہا جیسے وہ سب سمجھ گئے ہوں اور کوئیز کی شروعات کرتے ہوئے سوال کیا۔

"تم بتاؤ کپور۔ ہندوستان کا وہ کون سا بادشاہ تھا جس کے پاس چانکیہ جیسا قابل وزیر تھا؟"

"کیا وہ۔ کیا وہ۔ چندر کانت گپت تھا سر؟" نکو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"صحیح۔" مسٹر رودرا نے شاباشی دینے کے انداز میں کہا۔

سب لڑکے منہ چھپا کر چپکے چپکے ہنسنے لگے۔ سب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ نکو کا جواب اندھیرے کے تیر کی طرح صرف تکے سے صحیح نکلا ہے۔ ورنہ اصل میں تو وہ نئے لڑکے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

سب کو انٹر ویل کا انتظار تھا کیونکہ نہ اُن لوگوں نے چندر کانت کو اسکول آتے وقت دیکھا تھا جو اُس سے بات کرتے اور کلاسوں کے بیچ میں بھی ٹائم نہیں تھا۔

ڈائننگ ہال میں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھنے کے بعد آنند نے چندر کانت سے کہا "پائن ہائٹس میں ویلکم چندر کانت (ہم تمھارا خیر مقدم کرتے ہیں) ہمیں امید ہے تمھیں یہ اسکول اچھا لگے گا۔"

"شکریہ۔ تم لوگ مجھے خالی چندر بھی کہہ سکتے ہیں۔ میری ہمیشہ سے خواہش تھی کہ میں ہاسٹل والے اسکول میں پڑھوں۔"

آنند نے اُس کو سب دوستوں سے ملوایا۔

انٹر ویل میں گھومتے ہوئے روی نے پوچھا۔ تمھیں کون سا کھیل پسند ہے چندر؟" "فٹ بال" روی کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ مگر فوراً ہی لٹک بھی گیا۔ جب چندر نے آگے کہا۔ "مگر میں آج کل کھیلتا نہیں ہوں۔"

"ارے!" آنند نے چندر کانت کو اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔ دیکھنے میں وہ اچھا خاصا صحت مند لگتا تھا۔ بس قد تھوڑا چھوٹا تھا۔ پھر اُس نے سوچا یہ لڑکا سُریش کا مقابلہ کیسے کرے گا۔

اُسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کیونکہ اُس نے دیکھا کہ سُریش اور اُس کے یاروں کی ٹولی اِدھر ہی آرہی تھی۔

کلاس کے سب لڑکے تماشہ دیکھنے کے لئے جمع ہوگئے۔

"ہلو" سُریش نے مسکرا کر کہا "میں کلاس کا سب سے طاقت ور لڑکا ہوں' اور ہر آنے والے کو مجھ سے طاقت آزمائی کرنی پڑتی ہے۔ اپنی آستین چڑھالو۔ اور آجاؤ۔"

چندر کانت نے باری باری سُریش کو اور تماشہ دیکھنے والے لڑکوں کو دیکھا۔ جو سب کے سب اُسے دیکھ رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ یہ مقابلہ خاصا سخت ہوگا اور لمبی سی سانس لے کر آہستہ سے کہا۔ "مقابلہ کے لئے بلانے کا شکریہ۔ مگر میں لڑائی وڑائی میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"ڈرپوک۔" سُریش نے حقارت سے منہ بنا کر کہا "آج سے تمھارا نام ڈرپورک چندر ہے۔"

آنند روی اور دوسرے لڑکوں کو اچھا نہیں لگا۔ اُن کے خیال میں چندر کانت کو سُریش کی

کھلواڑ کا جواب ایسے بودے پن سے نہیں دینا چاہیے تھا۔ نیا ہے ہار بھی جاتا تو وہ لوگ اُسے کوئی نیچا تھوڑا ہی سمجھتے۔ آنند نے اچانک خاموشی کو توڑا۔اور سُریش سے کہا کہ وہ چندر کانت کو چھوڑ دے۔
"ٹھیک ہے کپتان۔ چھوڑ دیتے ہیں۔ اُس چُھٹکو ڈرپوک چندر کو' جاکر چُھپ جائے' تمھارے نیکر کے پیچھے۔ " سُریش نے ہنس کر حقارت سے کہا۔ دبی۔ دبی ہنسی کی آوازیں سنائی دیں۔ چندر کانت صرف اپنے کندھوں کو جھٹک کر رہ گیا۔
"کوئی بات نہیں چندر۔ " ٹکو نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "ضروری تو نہیں کہ ہر کوئی لڑاکو ہو یا دھاچوکڑی والے کھیل' کھیلے۔ آؤ ہم خاموشی سے شطرنج کھیلیں۔
چندر کانت ٹکو کے ساتھ چپ چاپ چلا گیا۔ اُس واقعہ کے بعد چندر کانت کو لگا کہ یہ لڑکے ویسے تو اچھی طرح ملتے ہیں مگر اُس کو اپنے خاص گروپ میں شامل نہیں کرتے۔
ایک ٹکو تھا' جو چندر کانت کا وفادار ساتھی تھا۔ چندر کانت اُس کا بہت احسان مند تھا۔ کیونکہ اگر وہ نہ ہوتا تو وہ اپنے آپ کو بہت اکیلا اور الگ تھلگ محسوس کرتا۔ جب امتحان کا نتیجہ آیا تو ٹکو کے نمبر پہلے سے زیادہ آئے۔ اُس کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔
آنے والے کچھ ہفتے بہت ہلچل بھرے تھے۔ سال کے آخری دن انٹر اسکول فٹ بال میچ ہونا تھا۔ ساتھ ہی گھر جانے کی بھی ہلچل تھی۔ سب سامان باندھ رہے تھے۔ ایک دوسرے سے پتے لے رہے تھے۔ اور چھٹیوں میں ملنے کا وعدہ کر رہے تھے۔
ہیڈ ماسٹر نے میچ دیکھنے کے لئے والدین کو بھی بلایا تھا تاکہ اُس کے بعد وہ اپنے بیٹوں کو ساتھ ہی گھر لے جائیں۔
سُریش نے سن لیا تھا کہ چندر کانت کا پسندیدہ کھیل فٹ بال ہے۔ وہ اُس کا مذاق اُڑانے اور اُس پر طعنے کسنے کا کوئی موقعہ نہیں چھوڑ رہا تھا۔ اُس کو اسکول کی ٹیم میں چن لیا گیا تھا۔ اس لئے جب اُس کے اماں' ابا آئے تو اُس کی اکڑ چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ اُسی وقت ایک اور کار اُس کی کار کے پاس آکر رُکی اور چندر کانت سیڑھیوں سے اُتر کر تیزی سے اُس کے پاس آیا۔
سُریش کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں' کیونکہ چندر کانت کے ابا' میجر کی وردی

میں تھے۔

"کمال ہے کون سوچ سکتا ہے کہ ایک فوجی افسر کا بیٹا ایسا ڈرپوک ہوگا۔ لو بڑیا سا۔ جو کوئی کھیل نہیں کھیل سکتا۔" سُریش نے اپنے دوستوں سے کہا۔ چندر کے اماں ابا نے یہ الفاظ سُن لئے۔ میجر نے اپنی بیوی کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

میچ بہت ٹکر کا تھا۔ دونوں ٹیمیں اچھا کھیل رہی تھیں۔ دوسرے ہاف میں سُریش نے ایک ماہر کھلاڑی کی طرح اپنے سامنے والے لڑکے سے بال چھینی اور تیزی سے گول کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی اُس نے گول کیا اُس کے دوست خوشی میں پاگلوں کی طرح ناچنے لگے۔ چندر کانت نے بھی دوسروں کی طرح زور' زور سے تالیاں بجائیں۔ میچ کے آخر تک کوئی گول نہیں ہوا۔ سُریش کے گول کی وجہ سے 'پائن ہائٹس' اسکول ایک گول سے جیت گیا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے چندر کانت کے ابا سے درخواست کی کہ وہ جیتنے والی ٹیم کو ٹرافی دیں۔ میجر صاحب نے خاص طور پر سُریش کی تعریف کی کہ وہ بہت اچھا کھیلا۔

"آج میں نے طاقت اور مہارت کے مقابلے کی ایک اچھی مثال دیکھی۔ مگر طاقت الگ الگ طرح کی ہو سکتی ہے۔ جسمانی اور اخلاقی۔ اخلاقی طاقت کو آپ ہمت یا حاضر دماغی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اب میں اس پر کوئی لیکچر نہیں دوں گا۔ یہ کام میں آپ کے مارل سائنس کے ٹیچر کے لئے چھوڑتا ہوں۔" لڑکے زور سے ہنسے۔ "مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ایک کہانی سناؤں۔"

سب لوگ سیدھے ہو کر دھیان لگا کر بیٹھ گئے۔ میجر صاحب نے بات آگے بڑھائی۔ "ایک لڑکا تھا جو کھیلوں کا بہت شوقین تھا۔ میچ کھیل کر لوٹ رہا تھا کہ اچانک اُس نے سُنا کوئی مدد کے لئے چلا رہا ہے۔ وہ آواز کی طرف دوڑا۔ تو دیکھا کہ ایک چھوٹا سا بچہ ندی میں غوطہ کھا رہا ہے وہ فوراً ندی میں کود گیا جبکہ وہ تیرنا بھی نہیں جانتا تھا۔ بہت مشکل سے وہ بچے کو کھینچ کر ندی سے باہر لایا۔ بچے نے روتے روتے اُس سے کہا کہ میرے کتے کے پلے کو بھی بچایئے۔ اُس نے پلے کو اِدھر اُدھر تلاش کیا مگر وہ کہیں نہیں ملا۔ اتنے میں اور لوگ آگئے اور انھوں نے لڑکے اور پلے دونوں کو بچالیا۔

"اتنی دیر ٹھنڈے پانی میں رہنے سے اُسے ڈبل نمونیہ ہو گیا اور وہ سخت بیمار ہو گیا۔ یاد رکھئے

کہ وہ اس واقعے سے ذرا پہلے میچ کھیل کر آ رہا تھا۔ آج اُسی لڑکے کو اُس کی کلاس کے ساتھی ڈرپوک کہتے ہیں۔ اُنھیں حیرت ہوتی ہے کہ ایسا لڑکا ایک فوجی افسر کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے؟ مگر اتنی زیادہ چھیڑ چھاڑ اور جملے بازی کے بعد بھی اپنے بچاؤ میں اپنی صفائی میں وہ کچھ نہیں کہتا۔"

آٹھویں کلاس کے لڑکے سمجھ گئے کہ وہ چندر کانت کے بارے میں ہی بات کر رہے ہیں۔ سب کی سمجھ میں آگیا کہ چندر کانت کس لئے کھیلنے کو منع کر رہا تھا۔ انھیں چندر کانت کی یہ بات بھی بہت اچھی لگی کہ اُس نے کوئی بہانہ بھی نہیں بنایا۔ اپنی بہادری کی ڈینگیں بھی نہیں ماریں' جب کہ سب اُسے 'ڈرپوک' کہتے رہتے تھے۔

سُریش کو سب سے زیادہ اپنے آپ پر شرم آ رہی تھی۔ اُس نے چندر کانت کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "مجھے معاف کر دو دوست۔ میں نے تم پر بہت بُرے بُرے جملے کسے تھے۔ تم واقعی کمال کے آدمی ہو۔ مجھ پر کوئی اس طرح کی جملے بازی کرتا تو میں کبھی چپ نہیں رہ سکتا تھا اور نہ ہی مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں تیرنا جانے بغیر ندی میں کود جاتا۔"

"چھوڑو یار!" چندر کانت نے مسکرا کر کہا۔ "تمھاری وجہ سے مجھ کو جیسا پیارا دوست مل گیا۔"

بھوندو - ہُد ہُد

جنگل کاٹ کر جو کھیت بنائے گئے تھے ان میں آم کا ایک بہت اونچا اور موٹا سا پیڑ تھا' جس کی ڈالیاں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں پیڑ کی ایک اونچی ڈال پر سنہرے پروں والے ہُد ہُدوں کا ایک جوڑا سوراخ کر کے اپنے بچے پال رہا تھا۔ بھوندو اس خاندان کا سب سے چھوٹا بچہ تھا کیونکہ وہ سب سے چھوٹا اور کمزور تھا۔ اس لیے ماں باپ اُس کو بہت ڈانتے پھٹکارتے رہتے تھے۔ ڈانٹ کھا کھا کر وہ ایسا بگڑا کہ کاہل ہو گیا۔

بھوندو کی دو بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ جیسے ہی اُن کے اُڑنے والے پر نکلے، اُنھوں نے اماں ابّا سے ضد کرنا شروع کر دی کہ انہیں اُڑنا سکھائیں۔ ماں باپ نے خوشی خوشی انہیں اُڑنا سکھایا۔ پھر یہ بھی سکھایا کہ کھانا کیسے تلاش کرتے ہیں۔ اور جلدی ہی وہ دن آگیا جب بھوندو کے بہن بھائی چیں چیں چیں کرتے انہیں خدا حافظ کہہ کر اُڑ گئے۔

بھوندو نے مل کر بھی نہیں دیا۔ کاہلی کے ساتھ ساتھ اُسے اپنا آم کا پیڑ اور اُس کے آس پاس کی جگہ بھی بہت پسند تھی۔ آم کا پیڑ تالاب کے کنارے تھا۔ اس لیے آس پاس سے بہت سے جنگلی جانور وہاں آتے تھے۔ بھوندو اپنے گھونسلے کے سوراخ سے بیٹھے بیٹھے نیچے کا تماشا دیکھا رہتا۔ کچھ جانور پانی پینے کے بعد کھیلنے لگتے۔ بندر' ہاتھیوں اور ہرنوں کو کھیلتا دیکھ کر اُسے بڑا مزا آتا۔

کبھی کبھی بھوندو کو شیر اور تیندوے بھی دکھائی دے جاتے۔ بھوندو کے ابّا نے اُس کو بتایا تھا کہ اصل میں یہ رات کے جانور ہیں جب بھی دن میں یہ تالاب پر آتے چاروں طرف ہلچل مچ جاتی۔ ان شاندار جانوروں کو دیکھ کر بھوندو کو اتنا مزا آتا کہ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ بھوندو کی زندگی مزے میں گذر رہی تھی۔ اُسے دنیا کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اُس کے ماں باپ اُسے کھانے کو

دیتے اور اُس کی دیکھ بھال کرتے۔ اس لیے اُس نے طے کر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ اُسی گھونسلے میں رہے گا مگر بھوندو کے اماں ابا بہت پریشان ہونے لگے تھے۔ وہ خاندان کی ذمہ داریاں اٹھاتے اٹھاتے تھک گئے تھے۔ اب انہیں آرام کی ضرورت تھی۔ وہ یہ گھونسلا چھوڑنا چاہتے تھے۔ مگر وہ سوچتے تھے کہ جانے سے پہلے بھوندو کو اپنا خیال خود رکھنا سکھا دینا بھی ان کا فرض ہے۔ مگر بھوندو ایک نالائق شاگرد تھا۔ اُسے چھوٹی چھوٹی باتیں سکھانے کے لیے رَس بھرے کیڑوں کی رشوت دینا پڑتی۔ اُسے اُڑنے سے ڈر لگتا تھا۔ اور وہ اُڑنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔ آخر میں اُس کے ابا اُسے نیچے دھکیل دیتے' اور زمین پر گرنے کے ڈر سے بھوندو پر پھڑ پھڑانے لگتا۔ دیکھتے دیکھتے وہ اُڑنے لگا۔

اُسے ہد ہد کی طرح اپنے کھانے کے لیے شکار کرنا سکھانا اور بھی مشکل ہو گیا۔ جب ساری کوششیں ناکام ہو گئیں تو اُس کے اماں ابا نے اُس کا کھانا بند کر دیا۔ یہ ترکیب کامیاب رہی۔ وہ سبق سیکھنے کو تیار ہو گیا۔

بھوندو کے اماں ابا اُسے قریب ہی ایک پیڑ کے پاس لے گئے۔ اماں اور بھوندو دیکھنے لگے' اور

اُس کے ابّا نے کام شروع کیا۔ یہ ایک موٹا اور سیدھا پیڑ تھا۔ ابّا اوپر تک چڑھتے چلے گئے جگہ جگہ رُک کر وہ چونچ سے کھٹ کھٹ کرتے۔ وہ چھال میں چھپے کیڑے اور لاروے تلاش کر رہے تھے۔ اگر کسی جگہ سے کھوکھلی لکڑی کی آواز آتی تو اس کا مطلب ہوتا کہ وہاں کوئی کام کی چیز مل سکتی ہے۔ اگر انہیں لگتا کہ وہ کوئی کام کی جگہ چھوڑ آئے ہیں تو وہ اڑتے اُڑتے ایک دم پلٹ آتے۔ بہت کم چڑیاں ایسا کر سکتی ہیں۔

بھوندو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ "ابّا ایسا کیسے کر لیتے ہیں؟" "بہت آسان ہے۔" اُس کی اماں نے سمجھایا۔ "ہماری ٹانگیں چھوٹی اور مضبوط ہیں۔ ناخن تیز ہیں۔ اور ہمارے پنجے آگے اور پیچھے دونوں طرف اس طرح نکلے ہوئے ہیں۔ کہ ہم پیڑ کی چھال کس کر جکڑ لیتے ہیں۔"

"مجھے تو یہ سب بے وقوفی لگتی ہے۔ ہم دوسری چڑیوں کی طرح ٹہنیوں پر بسیرا کرنے کی بجائے مداریوں کی طرح یہ سب تماشا کیوں کرتے ہیں؟" بھوندو نے مذاق کیا ہُد ہُد ابا کو کوئی لاروا مل گیا' انہوں نے بھوندو کو اوپر بلایا' جب بھوندو اوپر پہونچ گیا تو ابّا نے اپنی چھوٹی سی اکڑی ہوئی دم کس کر پیڑ پر جمائی۔ تنے کو مضبوطی سے پکڑا۔ سر اٹھایا' اور حملہ شروع کر دیا۔ ڈھر ڈھر۔ ڈھر .... لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چاروں طرف اُڑنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے بجلی کی ڈرل مشین چل رہی ہو۔ بھوندو ہکا بکا رہ گیا۔ "واہ۔ کیا بات ہے۔ کمال ہو گیا......" وہ چلایا۔ اُس نے اپنی اماں سے پوچھا۔ "یہ کیسے کرتے ہیں ابّا!؟"

"اپنی چونچ کو دیکھو بیٹے" اماں نے کہا۔ مگر فوراً انہیں خیال آیا۔ کہ وہ چونچ کیسے دیکھ سکتا ہے۔ چونچ تو اُس کی آنکھوں سے بالکل ملی ہوئی ہے۔ دونوں اپنی ننھی منی باریک سی آواز میں ہنسنے لگے۔ کیں کیں کررر پھر اماں نے اُس کو سمجھایا۔ میری چونچ کو دیکھو بھوندو۔ اُس کی بناوٹ بالکل چھینی جیسی ہے۔ ہمارا سر ہتھوڑی ہے۔ جو گردن اور کمر کے پٹھوں کی طاقت سے چلتا ہے۔ ان اوزاروں کی مدد سے ہم لکڑی میں سوراخ کر سکتے ہیں۔"

"پر لکڑی میں سوراخ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" بھوندو نے پوچھا۔

"کیونکہ ہمارا جسم ایسے ہی کام کرنے کے لیے بنا ہے۔ ہم اپنے جسم کے بناوٹ کے مطابق کام

کرتے ہیں۔ پیڑوں کے تنوں میں کیڑوں کا شکار کرنے کے لیے"

یہ بات بھوندو کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اماں نے اُس کی نظروں میں اُس کام کی عزت بڑھانے کے لیے کہا۔ "ہم لوگ اس کام میں ماہر ہیں نا!" جوش میں آکر انہوں نے بھوندو کے کندھے کو تھپ تھپایا اور اکڑ کر کہا۔ "ہمارا یہی فن ہے۔!"

اُسی وقت میناؤں کا ایک جوڑا پیڑ پر آکر بیٹھا۔ اماں نے اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دونوں اپنے جسم کی بناوٹ کے مطابق زندگی گزارتے ہیں مگر یہ ہماری طرح فن کار نہیں ہیں۔ یہ تو بڑے فخر کی بات ہے بیٹے کہ تم ایسا کام کرتے ہو جو دوسرے نہیں کر سکتے؟ ٹھیک ہے نا۔!؟"

کاہل بھوندو جو آرام سے زندگی گزارنا چاہتا تھا' اپنی اماں کی باتوں سے بالکل خوش نہیں ہوا۔ اس کے بجائے اُس نے لبا سے پوچھا۔ "لبا ایسے کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کرنے سے آپ کے سر میں درد نہیں ہوتا؟"

"نہیں بھوندو۔" انہوں نے جواب دیا۔ اور سمجھایا کہ "ہمارے دماغ کے پاس گدے دار گوشت اور اسپنج جیسی نرم ہڈیاں ہوتی ہیں۔ جو دماغ کو جھٹکوں سے بچاتی ہیں۔" اس بیچ میں بھوندو کے لبا نے کھدائی کا کام ختم کر لیا۔ اور بھوندو سے کہا کہ وہ اُن کی جگہ آکر اپنی چونچ اندر ڈالے۔ جہاں تک اُس کی چونچ جائے چونچ ڈالے۔ پھر زبان نکال کر اندر ڈالے۔ بھوندو کو یہ جان کر بہت حیرت ہوئی۔ کہ وہ اپنی زبان چونچ سے باہر بہت آگے تک نکال سکتا ہے۔ اُس نے اپنی لمبی کھردری زبان جو تھوک سے چپ چپی ہو رہی تھی' اندر پڑے لاروا پر پھیری لاروا اٹھایا اور منہ میں رکھ کر ندیدوں کی طرح کھانے لگا۔

"اب تمہاری باری ہے بیٹا۔" اُس کے لبا نے کہا۔ بھوندو کو یہ خیال کچھ اچھا نہیں لگا' مگر جب اُس کے اماں لبا نے بہت زور دیا۔ تو وہ کوشش کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ یہ فالتو کام جلدی سے جلدی ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اُس کے لبا نے اُسے کھدائی کرنے کی جگہ ڈھونڈ کر دے دی۔ وہ اوپر چڑھ تو گیا' مگر نہ تو اُس نے اپنے جسم کو ٹھیک جگہ پر جمایا' نہ تنے کو ٹھیک سے پکڑا۔ اور اپنی دم بھی ٹھیک سے نہیں نکالی۔ اور لگا ہتھوڑے کی طرح چونچ چلانے۔ بس پھر کیا تھا۔ سر میں ایسے جھٹکے لگے کہ سر میں درد ہونے لگا۔ بلکہ تنے پر اُس کی پکڑ بھی ڈھیلی ہو گئی۔ اور وہ دھڑام سے نیچے گر پڑا۔ بس اُسی وقت

اُس نے طے کر لیا کہ بد بدوں کی طرح جینا اُس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اُس نے اپنے اماں ابّا سے پوچھا کیا وہ کچھ اور نہیں کھا سکتا۔ "کیوں نہیں۔ تم کچھ پلپلے پھل بھی کھا سکتے ہو کبھی کبھی اور منہ کا مزا بدلنے کے لیے چیونٹوں کا شکار بھی کر سکتے ہو۔" اُس کی اماں نے اُسے بتایا۔

مگر اُس کے سوال سے ماں کچھ پریشان سی ہوئی اور اُس نے پوچھا "تم چاہتے کیا ہو بھوندو؟"

اُس نے جواب دیا۔ "اگر میں زندگی گزارنے کا کوئی آرام دہ اور آسان طریقہ اپنالوں تو مجھے پیڑوں میں سر مارنے اور اُس کے بدلے میں سر کا درد لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

اُس کی اماں کو غصہ تو بہت آیا مگر پھر بھی انہوں نے ایک آخری کوشش کرتے ہوئے بھوندو کا دل بڑھنے کے لیے کہا۔ "بیٹے قدرت کے کارخانے میں ہماری ایک خاص جگہ ہے۔ بہت اہم اور ضروری جگہ۔ یہ جو پیڑ تم آس پاس دیکھ رہے ہو، کب کے ختم ہو جاتے، مر جاتے اگر ہم دیمک، گھُن اور دوسرے ایسے کیڑوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نہ کھا جاتے جو لکڑی کو کھوکھلا کرتے ہیں۔" انہوں نے آگے کہا، "یہ آم کا پیڑ جو تمہیں بہت اچھا لگتا ہے۔ میرے اور تمہارے ابا کی وجہ سے ہی دشمنوں سے بچا ہوا ہے۔"

بھوندو نے ہر بات ماننے سے انکار کر دیا۔

جب وہ اپنے گھونسلے میں واپس پہنچا تو اس کے ابا نے اُس کی اماں کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اُن کی طرح تھکی تھکی اور اکتائی ہوئی سی لگ رہی تھیں۔ ابا نے کہا، "مجھے لگتا ہے اب ہمیں اور وقت خراب نہیں کرنا چاہئے۔ بھوندو کو اب خود ہی سیکھنا پڑے گا۔" آخر وہ دونوں اُداس اور دُکھی دل سے بھوندو کو گھونسلے میں چھوڑ کر اُڑ گئے۔

بھوندو کو ابا اماں کے جانے کا کوئی خاص دُکھ نہیں تھا۔ ایک طرح سے وہ خوش ہی تھا کہ وہ چلے گئے۔ ہر وقت بیکار اُسے ڈانٹتے پھٹکارتے رہتے تھے۔ "اب مجھے کوئی پریشانی کوئی فکر نہیں ہے۔" اُس نے زور سے چلا کر کہا۔ تاکہ سارے جانور اور چڑیاں سُن لیں۔ "بولو ہے کوئی پریشانی مجھے؟" اُس نے پوچھا "کیا میں شاندار اور خوبصورت نہیں ہوں؟" وہ سچ مچ خوبصورت تھا۔ سارے جسم پر سفید اور کالی بندیاں، بوٹے پر چمکتے ہوئے سنہرے پر اور گہرے لال رنگ کی کلغی۔ کتنے خوبصورت رنگوں سے

مل کر بنا تھا وہ اس کی خوبصورتی اور بڑھ جاتی جب وہ ہُدہُدوں کے خاص انداز میں جھٹکے لے لے کر اُڑتا۔ کبھی اوپر کبھی نیچے۔ کبھی نیچے کبھی اوپر۔

"کیا میں ہوشیار نہیں ہوں؟" بھوندو نے پکا فیصلہ کر لیا کہ وہ دوسرے ہُدہُدوں کی طرح لکڑی سے سر پھوڑنے والا احمق نہیں بنے گا۔

"کیا میرے پاس میرا اپنا پیارا سا پیڑ نہیں ہے؟" اُسے اپنے جنگلی آم کے پیڑ سے بہت پیار بھی تھا۔ اور گھمنڈ بھی۔ وہ اُسے اپنا ہی پیڑ سمجھتا تھا۔ آم کا پیڑ اونچا لمبا اور شاندار تھا۔ اور اُس وقت اُس پر بور (آم کا پھول) کھل رہا تھا' چاروں طرف اُس کی بھینی بھینی خوشبو پھیل رہی تھی۔ بھوندو ہنسا اور خوشی سے اپنے پروں سے تالیاں بجانے لگا۔

مگر اس کی یہ خوشی تھوڑی ہی دیر کی تھی۔ اُس کے پیٹ میں بھوک سے گُڑگُڑاہٹ سی ہونے لگی۔ وہ ابھی کھانا حاصل کرنے کی کوئی اچھی سی ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ کٹھ پھڑیوں کا ایک جوڑا آم کے پیڑ پر آکر بیٹھ گیا۔ بھوندو انہیں مار کر بھگانے والا ہی تھا کہ ایک دم اُسے خیال آیا کہ اُن سے اُن کے

شکار کا طریقہ سیکھ لیا جائے۔ وہ انہیں غور سے دیکھنے لگا۔ کٹھ پھوڑیاں بھی ہُدہُدوں کی طرح پیڑ کے تنے پر اوپر نیچے چڑھنے اترنے لگیں۔ بس فرق اتنا تھا کہ وہ ہُدہُدوں کی طرح لکڑی میں سوراخ کرنے کی بجائے تنے کی چھال میں پڑی ہوئی دراڑوں میں سے کیڑے نکال نکال کر کھا رہی تھیں۔ "کتنے سمجھدار ہیں یہ چھال کے داروغہ" بھوندو نے سوچا۔ اور کٹھ پھوڑیوں کے جانے کے بعد وہ اُن کی نقل کرنے لگا۔ مگر اُس کی زبان اتنی لمبی اور بڑی تھی کہ چھال کی چھوٹی چھوٹی درزوں میں گھس ہی نہیں پاتی تھی۔ اُس کی اناڑی پن کی کوششوں سے کیڑے ہوشیار ہو کر اور اندر جا کر چھپ جاتے۔ دن بھر کوشش کرنے کے بعد بھی بھوندو کے ہاتھ کچھ نہیں لگا بلکہ ایسی بھوک لگی جیسی آج تک کبھی نہیں لگی تھی۔ وہ گڑمڑی سا ہو کر اپنے گھونسلے میں جا کر لیٹ گیا۔ اور ساری رات بھوک سے تڑپتا رہا۔

اگلے دن صبح پیڑ پر سب سے پہلے آنے والا مہمان ایک پدی چڑیا تھی۔ وہ پھدک پھدک کر کبھی پتیوں کے ایک گچھے پر بیٹھتی کبھی دوسرے پر اور اور اپنی چونچ پتیوں میں گھسا گھسا کر خوب کیڑے پکڑتی یہ تو بہت آسان کام ہے۔ اُس نے سوچا۔ بھوندو نے پدی چڑیا کو "پتیوں کی داروغہ" کا نام دے دیا۔ اور سوچا یہ بہت ہی چالاک شکاری ہے۔ اُس صبح وہ پتیوں کی داروغہ کی طرح کیڑے پکڑنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر اُسے لگا کہ وہ اُس کام کے لیے بہت بھاری ہے اور اُس کی چونچ بھی ایسے نازک کام کے لیے ضرورت سے زیادہ لمبی ہے۔

اگلا جانور جس پر بھوندو کی نظر پڑی ایک گرگٹ تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اُسے نظر آیا۔ کیونکہ دور سے دیکھنے پر وہ اُس آم کی پتی جیسا لگ رہا تھا جس کے نیچے وہ چھپا بیٹھا تھا۔ بھوندو کے دیکھتے دیکھتے گرگٹ نے اپنی زبان جھٹکے سے باہر پھینکی اور بہت صفائی سے ایک شہد کی مکھی کو پکڑ لیا۔ جو بور کے ایک گچھے پر منڈلا رہی تھی۔ بھوندو کو یاد آیا کہ اُس کی زبان بھی تو لمبی ہے۔ اس لیے گرگٹ کی طرح شکار کرنا اُس کے لیے آسان رہے گا۔ جب بھوندو نے کوشش کی تو اُسے لگا کہ چاہے وہ کتنی بھی کوشش کر لے' اپنی گہری لال کلغی اور سنہری پیٹھ کے ساتھ پتیوں کے پیچھے چھپنا اُس کے بس کی بات نہیں۔ کسی نہ کسی طرح جب وہ کیڑے کے پاس پہنچ بھی جاتا تو اُسے لگتا کہ اُس کی زبان اتنی لمبی اور تیزی سے حرکت کرنے والی نہیں ہے کہ وہ اس کام میں کامیاب ہو سکے۔

اگلی صبح بھوندو نے دیکھا کہ ہرے توتو کا ایک جھنڈ ایک خاص سمت میں اُڑا جارہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد کچھ مینائیں بھی اُن کے پیچھے پیچھے اُڑتی ہوئی گئیں۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ سنہرے پیلکوں کا ایک جوڑا اُس طرف سے واپس آیا۔ بھوندو اُن کے پاس گیا اور جدھر سے وہ آئے تھے اُس طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "دوستو وہاں کیا ہورہا ہے۔؟"

"ارے بھائی تمہیں نہیں معلوم اُدھر پانچ منٹ کی اُڑان کے بعد ایک برگد کے پیڑ پر پھل آرہے ہیں۔"

بھوندو کو یاد آیا کہ اُس کی اماں کبھی کبھی اُسے پھلوں کا گودا کھانے کو دیتی تھیں اور کہا کرتی تھیں۔ کہ وہ پلپلے پھل بھی کھا سکتا ہے۔ پیلکوں کا شکریہ ادا کرکے وہ برگد کے پیڑ کی طرف دوڑ پڑا۔

جب بھوندو برگد کے پیڑ کے پاس پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ وہ پیڑ پھلوں سے لدا ہوا ہے۔ اور بہت سی چڑیاں اور کچھ جانور پھلوں کا مزا لے رہے ہیں۔ وہ سب بہت خوش تھے اور بہت شور مچارہے تھے۔ بھوندو بھی اُس دعوت میں شامل ہو گیا۔ پھل زیادہ مزے کے نہیں تھے مگر بھوندو کو بہت بھوک لگی تھی۔ پھل کھانے والی چڑیوں نے پہلے کبھی کسی ہُدہُد کو ایسے ندیدوں کی طرح پھل کھاتے

نہیں دیکھا تھا۔ وہ سب پھل کھانا چھوڑ چھاڑ بھوندو کو بھونڈے پن سے پھل کھاتا دیکھنے لگیں۔ کچھ کم عمر کی چڑیاں تو اُس کا مزاق اُڑانے لگیں۔ مگر بھوندو کسی کی پرواہ کیے بغیر پھل کھانے میں جُٹا رہا۔ تب تک کھاتا رہا۔ جب تک اس کا پیٹ نہیں بھر گیا۔ پھر جب وہ اپنے آم کے پیڑ پر واپس پہنچا۔ تو اُسے اپنی طبیعت کچھ گڑبڑ سی لگی۔ تھوڑی دیر میں اُس کے پیٹ میں سخت درد شروع ہو گیا۔ اُس کے بعد وہ کئی دن تک بیمار رہا اور یہ بات اُس کی سمجھ میں آگئی کہ ایک آدھ پھل کی بات اور ہے مگر پھلوں کی تگڑی دعوت جھیلنا اُس کے پیٹ کے بس کی بات نہیں۔

کسی نہ کسی طرح بھوندو اُس مصیبت سے بچ تو گیا۔ مگر پھر بھی اُس نے اس سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ وہ اب بھی زندگی گزارنے کے کسی آسان طریقے کی تلاش میں تھا۔ تین الگ الگ قسم کے 'اُڑن شکاری' پرندے آم کے پیڑ پر آئے۔ یہ پرندے بہت مہارت سے اُڑتے اُڑتے ہی کیڑے پکڑ لیتے تھے۔ ان کی مہارت کی وجہ سے کیڑوں کو ہوا میں اُڑتے اُڑتے ہی پکڑ لینے کا کام اتنا آسان لگ رہا تھا کہ بھوندو نے طے کر لیا کہ وہ اُس کی کوشش ضرور کرے گا۔ مگر اُس کام میں بھی بھوندو بُری طرح ناکام رہا۔ ہر چڑیا کی دُم اُس کے رہن سہن کے حساب سے بنی ہوتی ہے۔ اہمیت کے اعتبار سے

دُم چڑیا کے لیے پروں کے بعد سب سے اہم چیز ہے۔ بھوندو کی چھوٹی سی اکڑی ہوئی دُم نے اُڑن شکاریوں کی طرح ہوا میں غوطہ لگانے اور مڑنے میں اُس کی کوئی مدد نہیں کی' دُم ہی کیا اُس کے پروں' بھاری جسم اور اُس کی چونچ بھی اُس کام کے لیے بیکار تھے' اس لیے بھوندو نے تھک کر یہ کوشش بھی چھوڑ دی۔

جس وقت بھوندو پیڑ پر بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے' تبھی پیڑ کے نیچے ایک جنگلی مرغی اپنے بچوں کو کھانا تلاش کرنا سکھا رہی تھی۔ مرغی کو دیمک کا ایک گھر مل گیا۔ اور اُس نے پنجوں سے کھرچ کھرچ کر اُسے کھود ڈالا۔ پھر اپنے بچوں کے ساتھ دیمک پکڑ پکڑ کر کھانے لگی...... "مجھے شروع سے یہی کام کرنا چاہئے تھا۔" بھوندو نے دل ہی دل میں کہا۔

جیسے ہی گرمی بڑھی جنگلی مرغی کا خاندان واپس جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ بھوندو اُڑ کر دیمکوں کے گھر پر جا پہنچا۔ کچھ دیمکیں مٹی کے ڈھیر کی مرمت میں لگی ہوئی تھیں جسے مرغی نے کھود ڈالا تھا۔ بھوندو نے انہیں پکڑ کر کھالیا۔ اُس کی چونچ میں دیمکوں سے زیادہ مٹی آئی مگر بھوندو کو میٹھی دیمکوں کے ساتھ مٹی کھانے میں بھی کوئی اعتراض نہیں تھا اُس کا پورا دھیان ان دیمکوں کی طرف تھا جو اُس سے بچ کر بھاگنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

مٹی کے چھوٹے چھوٹے ڈھیروں جیسا دیمکوں کا یہ گھر ایک ہرے بھرے کھلے میدان میں تھا۔ اوپر اُڑتے ایک باز نے بھوندو کو دیکھ لیا۔ باز کو بھی کبھی اتفاق ہی سے کوئی ہُدہُد اس طرح کھلے میدان میں نظر آیا تھا۔ شکاری پرندے نے شکار کرنے کے لیے غوطہ لگایا۔ ایک گلہری جو باز کو تاڑ رہی تھی اُس نے چلا کر خطرے کا اعلان کیا۔ اُس کی 'ٹرٹر' جنگل میں مشین گن کی آواز کی طرح گونج گئی۔ بھوندو بھی چونک گیا اور باز کو دیکھ لیا۔

شکاری باز سیدھا اُس کی طرف جھپٹا مار رہا تھا ہر لمحے اُن کے بیچ کی دوری کم ہو رہی تھی۔ بھوندو کے پاس بچنے کا موقع بہت کم تھا۔ ویسے بھی وہ اُڑنے میں کافی کمزور تھا۔ باز اتنے پاس آ گیا تھا کہ آرام سے حملہ کر سکے۔ اُس نے اپنے خنجر جیسے پنجے بھوندو کو پکڑنے کے لیے پھیلائے۔ بھوندو نے اپنی جان بچانے کے لیے جلدی سے اپنے قریب کی جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دی جہاں باز اُس کے

پیچھے نہیں آسکتا تھا۔ باز کے پنجوں میں صرف کچھ سنہرے پر ہی دبے رہ گئے۔ اس طرح بال بال جان بچ جانے سے بھوندو سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اُس نے مان لیا کہ 'میں یہاں پیڑ پر ہی سب سے زیادہ محفوظ ہوں۔ پیڑ کی ٹہنیاں اور پتے مجھے اوپر آسمان کی طرف سے ہونے والے حملوں سے بچا لیتے ہیں۔ مان لو اگر نیچے بھی کسی طرف سے حملہ ہو تو میں کم سے کم اتنی تیزی سے تنے کے پیچھے تو چھپ ہی سکتا ہوں کہ کوئی باز نہ پہنچ سکے۔' اس کے ساتھ ہی اُس کے دماغ میں ایک باز کی ایسی خیالی تصویر گھوم گئی' جو اُسے پکڑنے کے چکر میں تنے سے ٹکرا کر تڑپ رہا ہے اور مرنے کے قریب ہے۔ بھوندو مسکرانے لگا۔ جان بچ جانے کی خوشی میں وہ اپنی آس پاس کی دنیا کو ایک نئی نظر سے دیکھ رہا تھا۔

بھوندو کی اماں اپنے چھوٹے بیٹے کو بھولی نہیں تھیں۔ وہ اکثر بھوندو کی طرف سے پریشان رہتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے طے کیا چلو چل کر دیکھا جائے کہ بھوندو کیسا ہے۔ وہ آم کے پیڑ پر آئیں' بھوندو سمجھا کوئی انجان ہدہد آ گیا' اور ان پر حملہ کرنے کے لیے بڑھا کیونکہ وہ تو آم کے پیڑ کو اپنی جائیداد سمجھتا تھا۔ وہ دوسری چڑیوں کو تو پیڑ پر آنے دیتا تھا لیکن اگر کوئی ہدہد اتفاق سے اُدھر آ نکلتا تو وہ اُسے فوراً کھدیڑ دیتا' مار مار کر دور بھگا دیتا تھا۔ دوسرے کسی بھی ہدہد کو وہ اپنا دشمن سمجھتا۔ جب اپنی اماں کو اُس نے پہچان لیا تو خوش ہو کر انہیں پیڑ پر بلا لیا۔ اماں کو یہ دیکھ کر بہت دُکھ ہوا کہ بھوندو بہت دُبلا ہو گیا ہے۔ "کیا تم ابھی تک زندگی گزارنے کا کوئی آسان طریقہ ڈھونڈ رہے ہو' بیٹے "؟ انہوں نے پوچھا۔

"پہلے ڈھونڈ رہا تھا اماں اب نہیں۔ اب مجھے پتا چل گیا ہے کہ میں کیا نہیں کر سکتا۔" بھوندو نے جواب دیا۔

"میں بہت خوش ہوں بیٹے" اماں نے کہا اور اُسے مشورہ دیا۔ "تم وہ کام کرنے کی کوشش کرو جو تم بہت اچھی طرح کر سکتے ہو بیٹے' سمجھے!"

اُس کے بعد بھوندو کی اماں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا "بیٹے کیا تمہیں پتا ہے کہ تمہارا پیڑ بیمار ہے؟"

بھوندو کو یقین نہیں آیا۔ اُس نے پوچھا۔ "آپ کو کیسے پتہ اماں؟"

اماں نے جواب دیا۔ دیکھو اس کی پتیاں کیسی پیلی پڑ گئی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ لکڑی کو کھانے والے کیڑے' گھن' اِس کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔" پھر اُنہوں نے بھوندو کو خبردار کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تم نے جلدی سے کچھ نہیں کیا۔ تو یہ کیڑے تمہارے پیڑ کو ختم کر دیں گے' مار ڈالیں گے۔"
بھوندو کو کیڑوں کے ساتھ ساتھ اپنے اوپر بھی غصہ آرہا تھا۔ اُس نے اپنی اماں کو اطمینان دلایا۔
"میں ابھی اسی وقت دیکھتا ہوں ان کیڑوں کو۔"

"خوب شکار کرو۔ بیٹے" اماں نے دعا دی اور چلی گئی۔

کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ۔ بھوندو نے تیزی سے پیڑ کے تنے کو کھٹکھٹانا شروع کیا۔
کھوکھلی۔ کھوکھلی آواز آرہی تھی۔ ڈھرر۔ رر۔ اُس نے سوراخ کیا اور ایک گھن کو نکالا' جو پیڑ کو اندر

ہی اندر چاٹ رہا تھا۔ یہ کیڑا دوسرے کیڑوں سے زیادہ مزے دار تھا۔ بھوندو نے ہُدہُدوں کا خاص فن
آزمالیا تھا۔ یہ کام تھا تو بہت محنت کا مگر اُسے کر کے بھوندو کو اطمینان سا محسوس ہو رہا تھا۔ کئی دن تک
بھوندو دن دن بھر محنت کرتا رہا۔ آخر اُس نے اپنے پیارے پیڑ کو گھنوں سے بچالیا۔ وہ بہت خوش تھا
اُسے اپنے اوپر ناز تھا۔ اپنی جیت کی خوشی میں وہ گانے لگا۔

"کیں' کیں' کیں' کیں' بُکرارارکر"

شکاری

جاڑوں کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ اچانک فائر کی آواز گونجی ایک کے بعد ایک لگاتار فائروں سے پہاڑیاں گونج گئیں۔ اور اس گرج کے ساتھ ہی ہوا میں پہاڑی کوؤں کے جھنڈ کے جھنڈ پاگلوں کی طرح شور مچاتے ہوئے دیودار کے پیڑ کے چاروں طرف چکر لگانے لگے۔ دس سال کا بشنو چلتے چلتے ٹھٹک کر راستے میں ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔ جیسے اُس کی جان ہی نکل گئی ہو۔ 'شکاری پھر آگئے اب کس کی جان کے پیچھے پڑے ہیں۔'

دو چار چکردار راستوں پر کودتا پھاندتا بشنو بڑی سڑک پر آگیا جو اُس کے گاؤں کے اوپر سے گذرتی تھی۔ مشرق میں سورج پہاڑیوں کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔ بشنو کو معلوم تھا کہ اُسے فوراً کرنل دتا کے کھیتوں پر پہنچ جانا چاہیے جہاں وہ کام کرتا ہے۔ کھیتوں سے ملے سیب کے باغ میں ابھی بہت کام باقی ہے۔ آج کل سیب کے پیڑوں پر کیڑے مار دوا چھڑکی جا رہی ہے اور یہ کام صبح سویرے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ مگر وہ ابھی تو نہیں جاسکتا۔ اُسے یہ پتہ چلانا ہے کہ یہ فائر کیوں کیے گئے ہیں۔

بڑی سڑک پر جہاں وہ کھڑا تھا وہاں سے دو سو فٹ نیچے سیب کے باغ کو وہ صاف دیکھ سکتا تھا اُس کے بائیں طرف سیڑھیوں کی طرح گیہوں کے کھیت پھیلے تھے۔ گیہوں پک چکا تھا۔ اور اُس کی نازک ہری ہری بالیاں سنہری ہو چکی تھیں۔ کہیں کہیں تو کسانوں نے کٹائی بھی شروع کر دی تھی اور کھیتوں کے بیچ کٹے ہوئے پودوں کے ٹھنٹھ بھرے چوکور حصے نظر آرہے تھے۔

اک دم بشنو کی سمجھ میں آگیا۔ کٹائی کے وقت بچے کچے دانے چگنے کے لئے بہت سے تیتر جمع ہو جاتے ہیں۔ شکاری بھی یہ بات جانتے ہیں! ایک اور فائر ہوا۔ بشنو کھیتوں اور سیب کے باغ کو بھول گیا۔ اور وہ ہوا کے بگولے کی طرح گیہوں کے کھیت کی طرف جھپٹا۔

کھیتوں کے کنارے پہنچ کر اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پہاڑوں کے پاس کچھ آدمی

نظر آرہے تھے۔ مگر ان سب کو تو وہ جانتا تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان میں سے کسی کے پاس بندوق نہیں ہے۔ دھڑکتے ہوئے دل سے اُس نے تیزی سے کھیتوں پر نگاہ دوڑائی۔ مگر اُسے کہیں کوئی حرکت نہیں دکھائی دی۔ بس جب ہوا چلتی تھی تو گیہوں کی بالیاں لہلہانے لگتی تھیں کسی چڑیا کی چہچہاہٹ تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بس پہاڑی کوّے آسمان پر چکر لگا رہے تھے۔ 'کہیں نہ کہیں شکاری ہے تو! پر ہے کہاں؟ کیا وہ پھر فائر کرے گا؟'

بشنو نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر گیہوں کے پودوں میں جھانکا وہاں سے اُسے پودوں کے صرف ڈنٹھل دکھائی دے رہے تھے۔ پتیاں زیادہ گھنی نہیں تھیں۔ 'شاید یہی طریقہ آسان رہے گا۔ اُس گھس بیٹھیے کو ڈھونڈنے کے لئے' بشنو نے غصے میں گھونسے بناتے ہوئے سوچا۔ ■ اُس آدمی کو آج ضرور سبق سکھائے گا۔ اُس کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ یہاں چڑیوں کا شکار کرنے آگیا۔

'دھوم' اُس کا گھونسہ ہوا میں لہرا کر ہی رہ گیا کیونکہ اُسی وقت ایک تیتر کا بچہ پھرر' پھرر بھاگتا ہوا ڈنٹھلوں کے بیچ سے نکل آیا۔ اُس نے پر پھڑ پھڑا کر اڑنے کی ناکام کوشش کی مگر ایک طرف کو لڑھک گیا۔ 'اوہ یہ تو زخمی ہے۔' بشنو نے سوچا۔ اُس سے پہلے کہ شکاری اُسے پکڑے مجھے اُسے پکڑ لینا چاہیے۔

بشنو نے تیزی سے قدم بڑھائے۔ مگر تیتر لنگڑاتا ہوا گیہوں کے پودوں میں گھس گیا۔ بشنو کا منہ لٹک گیا۔ "رک جا" وہ بڑبڑایا۔ "میں تجھے کوئی تکلیف نہیں پہونچاؤں گا۔" مگر تیتر بھاگتا ہی رہا۔ بشنو بس بھر نیچے جھک کر چاروں ہاتھ پاؤں کے بل اُس کے پیچھے بھاگتا رہا۔ تیتر اور گھبرا گیا' اور جتنی تیز بھاگ سکتا تھا بھاگا۔

بشنو کی سمجھ میں اک ترکیب آئی اُس نے اپنا سوئٹر اُتارا' اُسے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر تیتر کے پیچھے لگ گیا۔ تیتر جان بچانے کے لئے پوری طاقت سے ٹھر رٹھر ر بھاگا۔ ایک بار پھر اُس نے پھڑ پھڑا کر اڑنے کی کوشش کی مگر پھر ایک طرف لڑھک گیا۔ بس اُسی وقت بشنو کو موقع مل گیا۔ آہستہ آہستہ تقریباً رینگتا ہوا وہ اُس کے پیچھے پہنچا اور بہت صفائی سے ایک ہی جھٹکے میں اپنا سوئٹر اُس

کے اوپر ڈال دیا۔ ایک منٹ بعد وہ تیتر کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے دبائے کھیت سے باہر کود گیا۔

بشنو پہاڑی پر تیز تیز چڑھ رہا تھا۔ گہری کنکھئی زمین پر ننگے پیر جیسے وہ اڑا چلا جا رہا ہو۔ اُس کے دائیں طرف کھیت تھے اور بائیں طرف کانٹے دار تاروں کی باڑھ جو کرنل دتا نے لگوائی تھی۔ پہلے کئی بار وہ اُس باڑھ کے نیچے سے نکل چکا تھا۔ مگر تیتر کو دبوچے ہوئے باڑھ کو اس طرح پار کرنا۔ یہ بھول وہ خواب میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ کہ وہ سیدھا سڑک کی طرف دوڑے اور الٹے ہاتھ کو مڑ کر کرنل دتا کے کھیتوں میں پہنچ جائے جہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔

زور لگا کر دوڑنے کی وجہ سے وہ دوہرا ہوا جا رہا تھا۔ وہ کھیتوں کے دوسرے کنارے پر پہنچنے ہی والا تھا کہ اس کے پیچھے سے ایک سخت آواز گونجی۔ "اے لڑکے 'فوراً رک جاؤ ورنہ میں گولی مار دوں گا۔" جواب میں بشنو اور تیز دوڑنے لگا۔" رک جاؤ" آواز نے پھر چلا کر کہا۔ شاید دو آوازیں تھیں۔ ایک منٹ بعد گولی چلنے کی آواز آئی۔ بشنو کو کچھ چھرے کانٹے دار تاروں سے ٹکراتے ہوئے سنائی دیئے۔ اُس کا سینہ اُس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا جو اُس کی اماں گھر پر آگ جلانے کے لئے استعمال کرتی تھیں مگر رکنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔

اور پھر اُسے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنائی دی۔ بھاری دھمک دار قدموں کی آوازیں۔ بڑی عمر کے آدمیوں کی آوازیں۔ جو اُسے بُرا بھلا کہہ رہی تھیں۔" ذرا ٹھہرو۔ ابھی ہم اُس کی گردن دبوچتے ہیں۔ تو کیا سمجھتا ہے اُس طرح دوسروں کا شکار لے کر بھاگ جائے گا!" قدموں کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ بشنو بھی اب تھکنے لگا تھا اور تیتر بھی بہت زیادہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ جیسے وہ ہاتھ سے چھوٹ ہی جائے گا۔ بشنو نے اُسے اور کس کر پکڑ لیا۔ اور بس دو چار قدموں میں وہ بڑی سڑک پر آ گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے آگے نکلی ہوئی چٹان نے بشنو کو چھپا لیا مگر ذرا ہی دیر میں پھر دکھائی دینے لگا۔ شکاری اُس کے بالکل پاس آتے جا رہے تھے۔ بشنو نے سڑک پر نظر ڈالی سڑک پہاڑ کے دوسرے کنارے تک جا کر ایک لمبا موڑ لیتی تھی پھر ڈھلان شروع ہوتا تھا جو کرنل دتا کے کھیتوں تک پہنچ جاتا تھا۔ بشنو اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ سڑک پر دوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا بہت لمبی سڑک ہے اور

یہ بات طے ہے کہ اگر ■ سڑک پر رہے گا تو شکاری اُسے ضرور پکڑ لیں گے اُسے کوئی چھوٹا راستہ پکڑنا چاہیے۔

بشنو بنا کچھ سوچے اک دم پلٹا اور اپنے اُلٹے ہاتھ پر جنگلی رس بھری کی گھنی جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دی۔ یہ جگہ مڑی مڑی اور ایک دوسرے میں اُلجھی کانٹے دار جھاڑیوں کا ایک جھنڈ سی تھی اور اُس کے نیچے ایک سیدھی ڈھلان تھی جو کرنل دتا کے کھیتوں تک پہنچ جاتی تھی۔ اُس سیدھی ڈھلان پر اترنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ صرف پہاڑی بکریاں ہی یہ کام کر سکتی تھیں۔ مگر بشنو نے بھی پکا ارادہ کر لیا تھا۔ کہ آج ■ یہ کوشش ضرور کرے گا کیونکہ یہی اُس کی آخری امید تھی۔

بشنو گھنی جھاڑیوں میں کہنیوں کے بل رینگنے لگا جب کوئی کانٹا آنکھوں کے بہت پاس آ جاتا تو ■ جلدی سے گردن نیچے جھکا لیتا۔ اُس کے بازوؤں اور ٹانگوں پر خراشیں پڑ گئیں اور خون بہنے لگا۔ اُس کی ایک آستین بالکل پھٹ چکی تھی۔ اُس کی اماں ناراض تو ضرور ہوں گی مگر کم سے کم تیتر کی جان تو اُس نے بچا ہی لی۔ بشنو نے جھک کر تیتر کو اپنے گال سے سہلایا اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا۔ "میں تمہیں ان کے ہاتھ نہیں لگنے دوں گا' کبھی نہیں۔" مگر اندر سے خود اُسے اپنی بات پر پورا بھروسہ نہیں تھا۔

جنگلی رس بھری کی جھاڑیوں سے نکل کر بشنو ڈھلان پر سیدھے نیچے اترنے کے بجائے ترچھا ترچھا دوڑنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ سیدھی ڈھلان پر اترنے کا سب سے اچھا طریقہ یہی ہے مگر یہ بھی کام نہیں آیا۔ اوس سے بھیگی ہوئی چھوٹی چھوٹی گھاس پر اُس کے پیر پھسلنے لگے۔ اب اُس کے علاوہ اُس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ بیٹھ کر پھسلنا شروع کر دے۔ زمین کا ذرا ہموار سا ٹکڑا آ جاتا تو وہ اُٹھ کر دوڑنے لگتا۔ اس طرح باری باری کبھی پھسلتا کبھی دوڑتا ہوا وہ جنگلی آلو بخارے کے اُس پیڑ تک پہنچ گیا۔ جو ڈھلان کے راستے کے بیچوں بیچ تھا۔

اپنی سانسیں درست کرنے کے لئے ذرا دیر رُکا۔ کیونکہ اس کا سانس سینے میں بیٹھ ہی نہیں رہا تھا۔ اُس کے چہرے سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ اُس کی قمیص بری طرح پھٹ گئی تھی اور دائیں پیر کے

انگوٹھے کی کھال چھل گئی تھی۔ آخر بشنو کرنل دتا کے گھر کے پچھواڑے لکڑی کے سائبان تک پہنچ ہی گیا۔ خوش قسمتی سے دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بشنو نے اندر چھلانگ لگائی اور جلانے کی لکڑیوں کے پیچھے چھپ گیا۔ تیتراب بھی اُس کے سینے سے لگا ہوا تھا۔

آہستہ آہستہ اُس کی سانسیں قابو میں آ گئیں اور دل ٹھیک سے دھڑکنے لگا۔ اُس کے ساتھ ہی جیسے اُس کے کانوں میں گونجنے والی شائیں شائیں کی آوازیں بھی تھم گئیں' اور آس پاس کی دوسری آوازیں سنائی دینے لگیں۔ باورچی خانے میں ککر کی سیٹی سنائی دے رہی تھی۔ مرغیاں اپنے ڈربے کو پنجوں سے کھرچ کھرچ کر دانے ڈھونڈ کر کھا رہی تھیں۔ اور کھیتوں میں کام کرنے والا سب سے پرانا اور بوڑھا امر سنگھ صحن میں جھاڑو دے رہا تھا۔ اچانک کتے کے بھونکنے کی تیز آواز گونجی۔ بشنو ڈر کر اپنی جگہ جم سا گیا۔ یہ 'ہنسا' کی آواز تھی۔ کرنل دتا کا ایلیشین کتا۔ 'ہنسا' کے بھونکنے کا بس ایک ہی مطلب تھا کہ کھیتوں میں کوئی انجان آدمی آیا ہے۔ اس کا مطلب شکاریوں نے اُسے ڈھنڈ ہی لیا۔

بشنو جانتا تھا کہ لکڑی کے سائبان میں اُسے کوئی خطرہ نہیں۔ یہاں صبح کے بعد کوئی نہیں آتا۔ یہاں ▪▪ آرام سے بہت دیر تک چھپا رہ سکتا ہے۔ کوئی اُسے نہیں ڈھونڈ سکتا۔ مگر وہ باہر کا حال جاننے کے لئے بری طرح بے چین تھا۔ اُس نے ایک پرانی ٹوکری ڈھونڈ کر تیتر کو سوئٹر سمیٹ اُس میں رکھ کر ٹوکری کا ڈھکنا کس کر بند کر دیا۔ اور دل میں کہا 'اب دیکھا جائے باہر کیا معاملہ ہے؟

لکڑی کے سائبان کی چھت پیچھے سے کافی نیچے تک جھکی ہوئی تھی۔ بشنو آہستہ سے اُس پر چڑھ گیا سلیٹ پتھروں کے ٹکڑوں پر دھیرے دھیرے پنجوں کے بل چلتا ہوا وہ ایک چمنی کے پیچھے چھپ گیا۔ چمنی کے اوپر سے اُسے فارم ہاؤس تک آنے والی ڈھلان صاف دکھائی دے رہی تھی جس پر دو خطرناک آدمی چلے آ رہے تھے۔ دونوں کے پاس بندوقیں تھیں اور کندھوں پر بڑے بڑے تھیلے لٹکے ہوئے تھے 'ہنسا کان پھاڑ دینے والی آواز میں بھونک رہا تھا اور کرنل دتا اُسے چپ کرا رہے تھے۔

"کہیے آپ لوگ یہاں کیسے آئے؟" اُنھوں نے آنے والے آدمیوں سے پوچھا۔

اُن میں سے ایک آدمی نے کہا "آپ کے ایک لڑکے نے ہمارا شکار چرا لیا ہے۔ ایک تیتر۔

ہو سکتا ہے دو بھی ہوں۔ ہم وہ واپس لے کر رہیں گے۔"

"اچھا تو وہ آپ کی بندوقوں کی آواز تھی؟"

"جی ہاں"

"آپ لوگ ہر سال آتے ہیں؟"

ہاں۔ اور اُس گاؤں کا سرپنچ لاھو رام ہمیں اچھی طرح جانتا ہے۔"

"آپ ان تیتروں کا کیا کرتے ہیں جن کا شکار کرتے ہیں؟"

"کھاتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ اچھا اب آپ مہربانی کر کے جلدی سے لڑکے کو ڈھونڈیے۔ اور ہماری چڑیاں ہمیں واپس دلوائیے۔"

کرنل دتا نے ابھی میدان نہیں چھوڑا تھا۔ اُنھوں نے دونوں آدمیوں کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور چلائے۔ "اچھا تو آپ لوگ ہر سال آتے ہیں بہت سارے تیتروں کا شکار کرتے ہیں۔ دو چار پکن کر لے جاتے ہیں اور باقی گیہوں کے کھیتوں میں تڑپنا چھوڑ دیتے ہیں مرنے کے لئے۔ میں پوچھتا ہوں اس کا کیا مطلب ہے؟"

وہ لوگ کچھ گھبرائے۔ اس جملے کے لئے وہ تیار نہیں تھے۔ کرنل دتا نے آگے کہا۔

"اگر آپ لوگ کھانے کے لئے شکار کرتے ہیں تو کم سے کم اتنا خیال تو رکھ ہی سکتے ہیں کہ بس اتنے ہی پرندے ماریں جتنی آپ کو ضرورت ہے اور جن چڑیوں کو آپ زخمی کر کے چھوڑ جاتے ہیں ان کا تو کچھ خیال کیجئے۔ برائے مہربانی آپ اسی وقت میرے کھیتوں سے نکل جایئے۔ میں آپ جیسے لوگوں سے اب ایک لفظ بھی بات نہیں کرنا چاہتا۔"

بشنو نے چمنی کے پیچھے سے دیکھا کہ وہ دونوں آدمی بنا کچھ کہے ایک دم مڑے اور تیزی سے چلتے ہوئے بڑی سڑک کی طرف چلے گئے۔ ایک منٹ بعد کرنل دتا کی آواز گونجی۔ "امر سنگھ جلدی سے دوا چھڑکنے کی مشین لاؤ۔ ہمیں فوراً باغ میں کام شروع کر دینا چاہیے۔"

بشنو چھت سے نیچے کودا اور تیتر کو ہاتھوں میں دبا کر دوڑ کر گھر میں چلا گیا۔ "بابو جی۔ بابو جی"
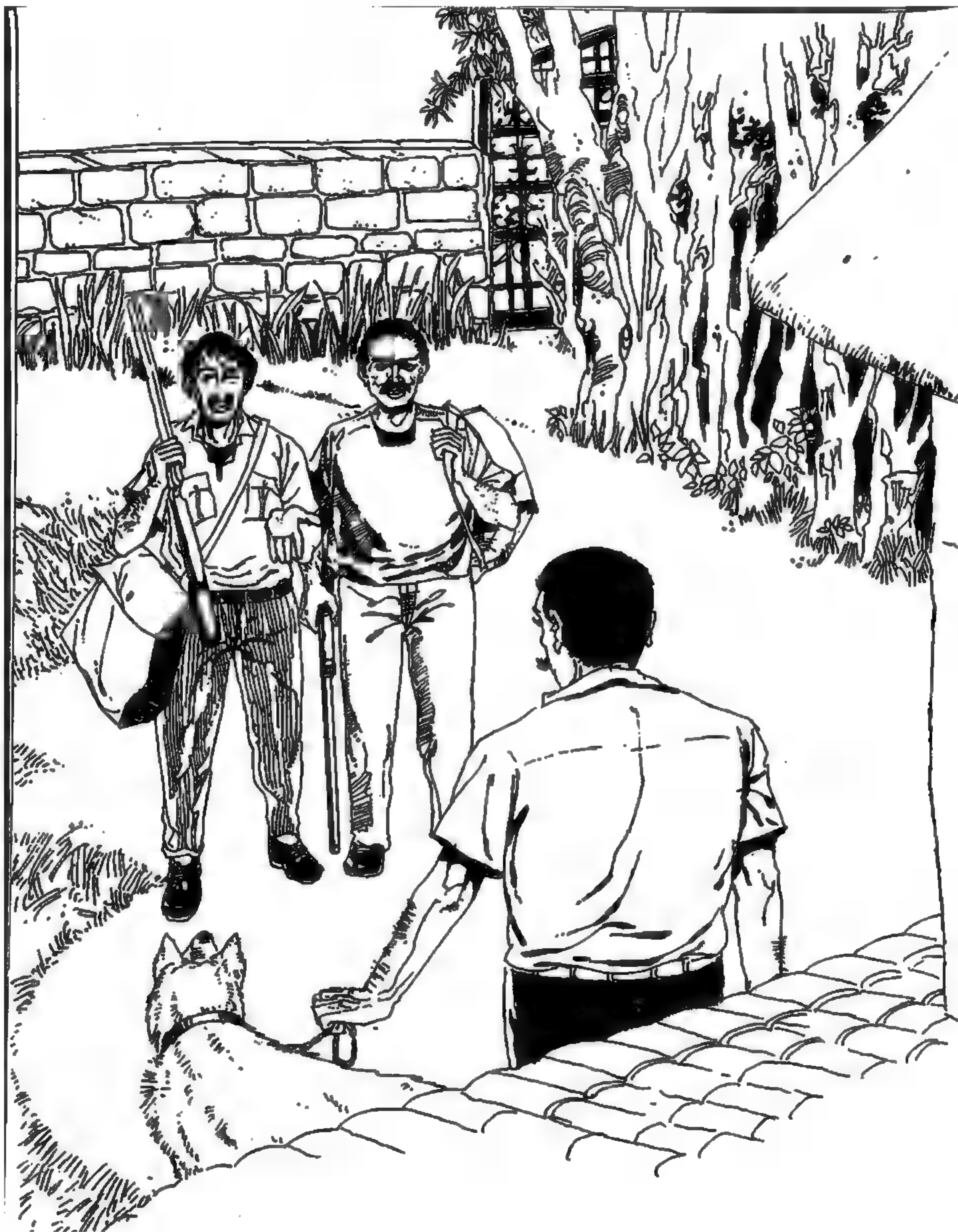
اُس نے آواز دی۔ "اُس تیتر کو دیکھئے یہ زخمی ہے۔"

کرنل دتّا نے غصّے سے گھور کر اُسے دیکھا۔ اور ڈپٹ کر پوچھا "اچھا تو وہ تم تھے، کیا کرو گے اس تیتر کا۔"

"پالوں گا اسے اور کیا؟" بشنو نے جواب دیا۔

کرنل دتّا نرم پڑ گئے "ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ پتہ ہے تمھیں تیتر بہت اچھے پالتو بن جاتے ہیں۔" اُنھوں نے تیتر کے زخم کا معائنہ کیا "ہوں۔ ایک بازو ٹوٹ گیا ہے۔ زخم تو شاید ایک دو دن میں بھر جائے گا مگر یہ اب کبھی پوری طرح اڑ نہیں پائے گا۔ اسے گیندے کی پتیوں کا عرق چاہیے 'دو چار بوند۔" اُنھوں نے بتایا۔

بشنو دروازے کی طرف دوڑا مگر کرنل دتّا نے آواز دے کر اُسے روکا اور کہا "اُسے دلیا کھلانا اور دیکھنا کچھ دن میں یہ ایک چھوٹے پلّے کی طرح تمھارے پیچھے پیچھے پھرا کرے گا۔ ارے ہاں یہ بتاؤ تمھیں تیتر کی آواز نکالنا آتی ہے۔"

بشنو فوراً سمجھ گیا اور تیتر کی آواز نکالی۔ "کیل کا کاکا۔ کیل کا کاکا۔"

"شاباش تم تو بالکل اصلی تیتر کی طرح بول رہے ہو۔" کرنل دتّا نے خوش ہو کر کہا۔ بشنو نے انھیں خوش ہو کر دیکھا اور اس کی باچھیں کانوں تک پھیل گئیں۔

چھوٹی سی بھول

"امّاں۔ امّاں! جلدی سے کچھ کھانے کو دو۔ پھر میں جاؤں گی۔" اسکول سے گھر آتے ہی میں نے امّاں سے کہا۔

میں امّاں کے کمرے کے دروازے پر رُک گئی۔ امّاں مجھے شیشے میں نظر آ رہی تھیں وہ جوڑا باندھ رہی تھیں۔ انھوں نے آج کریم کے سے رنگ کی ساڑی پہنی تھی جس پر گہرے اودے رنگ کی کناری تھی۔ "یہ تو باہر جانے والی ساڑی ہے نا امّاں؟" "میں پھولوں کی نمائش میں جا رہی ہوں۔ تم کہیں نہیں جاؤ گی۔" امّاں نے کہا۔

"پارک کے پیچھے پہاڑ پر پتنگ بازی کا مقابلہ ہو رہا ہے۔" میں نے آئینہ میں ان کے عکس کی طرف دیکھ کر التجا بھری نظروں سے کچھ گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "سمیر۔ رنجیت اور بڈّو اور اُس کے ساتھیوں کے بیچ۔ میں ضرور جاؤں گی امّاں، بس ایک دو گھنٹوں کے لئے۔" "بالکل نہیں" امّاں نے اپنے جوڑے میں اک اور پن لگاتے ہوئے کہا۔ "کیسی لگ رہی ہوں میں؟"

"بہت اچھی۔ بہت اچھی لگ رہی ہو امّاں۔"

"میں نے ایک ہفتہ پہلے تمہیں پھولوں کی نمائش کے بارے میں بتادیا تھا۔ میں سات بجے تک آؤں گی۔ تمھارے ابّا بھی گھر پر نہیں ہیں اس لئے تمھیں ہی گھر پر رہ کر پریتی کو سنبھالنا ہوگا۔" امّاں نے کہا۔

"مگر میں نے تو سمیر اور رنجیت سے وعدہ کیا تھا کہ میں ان کی ڈور چرخی سنبھالوں گی۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "آپ پریتی کو پھولوں کی نمائش میں کیوں نہیں لے جاتیں۔ اُسے بہت مزہ آئے گا۔ پھول اُسے بہت اچھے بھی لگتے ہیں۔"

"بیکار کی باتیں مت کرو۔" امّاں نے کہا "میں تم سے روز۔ روز تو چھوٹی بہن کو سنبھالنے کے لئے کہتی نہیں ہوں۔ "اور ہاں جب وہ سو کر اٹھے تو اُسے دودھ دینا مت بھول جانا۔" وہ ایڑیوں پر گھومیں اور کھڑکی سے باہر دیکھ کر بولیں۔ "رینو آ گئی۔ اب مجھے چلنا چاہیے۔ رسوئی میں تمھارے لئے

اُٹھا رکھا ہے اور کیلے بھی ہیں۔ اچھا بائی۔ بائی!"

مسز پاٹھک ہوا کے جھونکے کی طرح خوشبوئیں اڑاتی ہوئی اندر آئیں اور جھونکے کی طرح ہی لماں کو اڑا کر لے گئیں! میں اداس منہ لٹکائے بیٹھ گئی۔ ذرا سی دیر میں رنجیت اور سمیر سائیکل پر سوار گیٹ میں گھسے چلے آئے اور چلائے۔ "انجو! جلدی چلو! ارے کائل لڑکی چارج چکے ہیں۔" میں نے منہ بسورتے ہوئے انھیں اندر بلایا۔ اور پرام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں آسکتی۔ مجھے پریتی کی دیکھ بھال کرنی ہے۔" سمیر نے ہنس کر پوچھا: "کیا تم آیا ہو؟"

"میں کیا کرسکتی ہوں! بتاؤ" میں نے کانپتے ہوئے اپنے نچلے ہونٹ کو بڑی مشکل سے قابو میں رکھا۔ "لماں لال باغ میں پھولوں کی نمائش دیکھنے گئیں ہیں۔ میں سات بجے تک پھنس گئی ہوں یہاں۔"

رنجیت نے تھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ "اوہ وہ تو ہم کوئی ترکیب نکال لیں گے۔ ہاں۔ اگر تم خود ہی نہ جانا چاہو تو بات الگ ہے۔"

"میں جانا چاہتی ہوں۔ ضرور جانا چاہتی ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ رنجیت پریتی کو گھور رہا تھا جو کمبل اوڑھے آرام سے سو رہی تھی۔ "تو بس ہم اسے بھی ساتھ لے چلتے ہیں۔" اُس نے ہاتھ رگڑتے ہوئے کہا۔ وہ عام طور پر ایسا اُس وقت کرتا تھا جب اُسے کوئی نئی ترکیب سوجھتی تھی۔

رنجیت ایک سے ایک نئی ترکیبیں نکال لیا کرتا تھا مگر اُس کی یہ ترکیب مجھے کچھ زیادہ اچھی نہیں لگی۔

"یہ ابھی صرف دس مہینے کی ہے۔" میں نے پریتی کو غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔ جیسے یہ اُسی کی غلطی ہو۔ "تمھیں پتہ ہے یہ ابھی چل بھی نہیں سکتی۔"

رنجیت پرام کے پاس پہونچا اور اُس کے ہینڈل کو پکڑ کر آہستہ سے دھکا دے کر اُسے باہر کمرے میں لے آیا۔ اُس نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا "پرام تو چل سکتی ہے۔ سمجھیں میرا مطلب؟"

"بہت اچھے۔" سمیر چلایا۔ اگر ہم پرام کو ساتھ لے جائیں تو انجو پریتی کی دیکھ بھال بھی کرلے گی۔ اور پتنگ بازی کے مقابلے میں بھی حصہ لے لے گی۔"

"اور اگر پریتی جاگ گئی تو؟" مجھے ان کے منصوبے پر شک تھا۔

"اُس عمر کے بچے گھر کے اندر اور باہر کا فرق نہیں جانتے۔ کم سے کم میں تو اُس عمر میں نہیں

جانتا تھا۔ "رنجیت نے ایسے کہا جیسے وہ بہت عقل مندی کی بات کہہ رہا ہو۔ اور میں بے وقوف ہوں۔

"رنجیت ٹھیک کہتا ہے مجھے بھی اُس عمر میں اندر اور باہر کا کوئی پتہ نہیں چلتا تھا۔ چلو اب دیر کیوں کر رہے ہو؟" سمیر نے ٹکڑا لگاتے ہوئے کہا۔ میں بہت خوش تھی کہ ہم نے گھر سے نکلنے کی ترکیب سوچ لی ہے۔ رنجیت کے ساتھ میں پرام کو بہت دھیان سے دھکا دینے لگی اور سمیر نے دونوں سائیکلیں سنبھال لیں اس طرح ہم سڑک کے اُس کنارے تک آ گئے جس کے آگے پارک تھا۔

راستے میں ہم نے پرام کو جھٹکوں سے بچایا۔ اور پریتی کو پریشان کئے بغیر پارک میں آ گئے۔

پتنگ بازی کا مقابلہ پارک کے پیچھے پہاڑی ڈھلان پر ہونا تھا جیسے ہی ہم ڈھلوان کے پاس پہنچے سمیر چلایا "بڈو اور اُس کے ساتھی تو پہلے ہی آ چکے ہیں۔"

رنجیت نے پرام کو املی کے بڑے سے سایہ دار پیڑ کے نیچے لے جا کر کھڑا کیا اور بولا "اسے یہاں کھڑا کر دیتے ہیں۔ یہاں سے یہ ہم کو نظر بھی آتی رہے گی اور اگر پریتی اٹھ گئی تو رونے کی آواز بھی سنائی دے گی"

"شکر ہے کہ چھوٹے بچے دیر تک سوتے ہیں" میں نے اپنی چھوٹی بہن کے کمبل کو اس کے نیچے اچھی طرح دباتے ہوئے کہا۔ وہ بہت میٹھی نیند سو رہی تھی اور بالکل گڑیا سی لگ رہی تھی۔

مقابلہ میں چار پتنگیں اڑ رہی تھیں بڈو اور اُس کے ساتھی پتنگ اڑانے میں ماہر تھے مگر ہم نے بھی کئی دن بلکہ ہفتوں مشق کی تھی۔ میں نے "ہم" جان کر کہا ہے کیونکہ میں سمیر اور رنجیت کی طرف سے مقابلے میں شامل تھی اور میرا کام بڑا اہم تھا۔ پتنگوں کو سنبھالنا اور کٹی ہوئی پتنگوں کو لوٹ کر لانا۔

اگلا ایک گھنٹہ سچ مچ یاد رکھنے کے قابل تھا چار پتنگیں ایک ساتھ اڑیں۔ ہماری شاندار 'ہری اور سنہری' اور بڈو کی پیلی اور لال۔ ہماری ایک گلابی اور ایک کتھئی اور ان کی ایک نیلی اور ایک سفید۔ آسمان پر اڑتی یہ بڑی بڑی اور خوبصورت پتنگیں دھنک جیسے رنگ بکھیر رہی تھیں۔ ہوا چل رہی تھی پتنگیں اڑ رہی تھیں۔ کبھی کھینچ کبھی ڈھیل 'لڑکے لڑکیاں خوشی سے چلاتے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ کھیل بہت زوروں پر چل رہا تھا۔ ہلچل ہی ہلچل تھی۔

بڈو کی پتنگ جیتنے پر تلی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے پتنگ کو بھی پکا یقین ہو۔ وہ ایک بڑی سی لال

پیلی چڑیا کی طرح اوپر اور اوپر اڑی چلی جارہی تھی مگر ہم آرام سے ہار ماننے والے نہیں تھے۔

"شاباش رنجیت شاباش"

ہماری ہری اور سنہری پتنگ اب بڈو کی پتنگ کے برابر آگئی تھی۔

اُس نے جلدی جلدی اپنی پتنگ کو کئی جھکائیاں دیں اور اچانک اُس کی پتنگ نے ایک جھونک لی۔ بے قابو ہوئی اور نیچے کی طرف غوطہ لگایا اور آخر ٹیلی فون کے کھمبے میں جاکر پھنس گئی مگر ہماری ہری۔ سنہری حسینہ اب بھی شان کے ساتھ اوپر اٹھتی جارہی تھی اوپر اور اوپر اور اوپر۔ ہم جیت گئے۔

خوب تالیاں بجیں' شور مچا' کریں تھپتھپائی گئیں، ہم لوگ بہت تھکے ہوئے تھے مگر بے حد خوش تھے۔

"اب واپس چلا جائے۔" میں نے کہا۔ اور مجھے ایک دم یاد آیا کہ مجھے اب پریتی کو گھر لے جانا چاہئے۔ اُس سے پہلے کہ وہ دودھ کے لئے شور مچانے لگے۔ خوش خوش میں مڑی اور پریتی کو لینے پیڑ کی طرف دوڑ لگادی۔ مگر وہاں پہنچ کر میں ہکا بکا رہ گئی۔ غور سے ادھر اُدھر دیکھا۔ کئی بار آنکھیں جھپکا کر گھورا۔ سر کو جھٹک کر دوبارہ دیکھا۔ پرام وہاں نہیں تھی۔ کہیں چلی گئی تھی۔

میں ویسے جلدی گھبرا کر شور مچانے والوں میں سے نہیں ہوں' مگر اُس وقت میں اتنے زور سے چیخی کہ رنجیت اور سمیر دوڑ کر وہاں آگئے۔ "کیا ہوا؟"

"یہ...... یہ...... پرام...... یہ...... پریتی...... کہیں چلی گئی۔"

"کیا...... یا...... کیا!؟"

یہ بڑی بھیانک سی بات تھی۔ جیت کی ساری خوشی غبارے کی ہوا کی طرح نکل گئی۔ میری چھوٹی سی بہن پریتی کھو گئی تھی۔ رنجیت نے پوری کوشش کی کہ وہ سب کو سنبھالے "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمیں سکون سے رہنا چاہیے۔" لیکن وہ خود بہت گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

"انجو کیا تم کو پکا پتہ ہے کہ پریتی چل نہیں سکتی۔"

میں نے روتے ہوئے انکار میں سر ہلایا اور پہاڑی ڈھلان کے نیچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کہیں وہ ادھر..................!"

املی کے پیڑ سے تھوڑا نیچے کم سے کم سو فٹ نیچے گھنے جنگل جھاڑ اور پیڑ تھے۔ جہاں تک یہ ڈھلان سیدھی جاتی تھی۔ سمیر پہاڑی کے کنارے تک گیا اور نیچے جھانکنے لگا۔ پھر کندھے اچکا کر اُس نے کہا "ہاں ہو سکتا ہے پرام اپنے آپ لڑھک کر نیچے چلی گئی ہو۔ باپ رے کیا ڈھال ہے۔"

ڈر کے مارے میرے پیٹ میں لوہے کی گیند سی لڑھکنے لگی۔ ہم تیزی سے نیچے کی طرف دوڑے ۔ ہم نے ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر۔ کانٹوں بھری اندھیری جھاڑیوں کو دیکھا۔ بہت دیر تک تلاش کرنے کے بعد بھی جب کوئی کامیابی نہیں ملی تو رنجیت نے کہا "شکر ہے پرام نیچے نہیں لڑھکی' پر وہ

ہے کہاں؟" میں نے پوچھا اب ہم اوپر چڑھ رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی۔ کاش یہ سب ایک سپنا نکلے اور ہمیں پریتی پرام میں آرام سے سوتی ہوئی مل جائے۔ مگر املی کے پیڑ کے نیچے سناٹا تھا۔

سمیر نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا "مگر پریتی ہوا میں تو نہیں غائب ہو سکتی۔ میرے خیال میں تو ہمیں اب یہی مان لینا چاہیے کہ پریتی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔"

یہ سن کر میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ پڑا۔ رنجیت نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "آؤ ہم پارک میں بھی تلاش کر لیں۔" مگر پارک میں بھی بادامی رنگ کی پرام کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ رنجیت نے پریشان ہو کر میری طرف دیکھا۔ "معاملہ سچ مچ گڑبڑ ہے انجو، ہمیں فوراً چل کر اب تمھاری اماّں کو ڈھونڈنا چاہیے۔"

میں سمیر کی سائکل پر پیچھے بیٹھ گئی اور ہم لال باغ کی طرف چل دیے۔ جہاں پھولوں کی نمائش ہو رہی تھی۔ اچانک سمیر نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا تمھارے ابا۔ اماّں کے پاس کافی پیسہ ہے؟"

"کیوں؟"

"اغوا کرنے والے بہت پیسہ مانگتے ہیں۔" اُس نے ایسے گردن ہلا کر کہا۔ جیسے سب کچھ جانتا ہو۔ "دس لاکھ یا اُس سے بھی زیادہ۔"

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے ابا کتنا کماتے ہیں۔ ■ ایک دفتر میں کام کرتے تھے اور ہمارے پاس ایک اسکوٹر تھا۔ مگر میں نے بہادری دکھاتے ہوئے کہا "مجھے لگتا ہے اتنے پیسے کا انتظام ہم کر لیں گے۔"

پھولوں کی نمائش میں ہمیں اماّں کچھ عورتوں کے ساتھ کھڑی نظر آئیں۔ وہ سب پھولوں کو دیکھ کر بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔

"ماں"

■ ایک جھٹکے سے مڑیں اور ایسی بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھا جیسے آنکھیں نہ ہوں تشتریاں ہوں۔ "انجو! پریتی کہاں ہے؟"

"کہ...... کہیں...... و...... چلی...... گئی" میں ہکلائی۔ "یہ سب میری غلطی ہے اماّں میں اسے پرام میں لے کر پہاڑی ڈھلان پر چلی گئی تھی۔ جہاں سے وہ..........."

اماں کی چیخ میری اس چیخ سے بھی تیز تھی' جب میں نے پرام کو غائب دیکھا تھا۔ اگلے کچھ منٹ مجھ پر بہت برے گزرے۔ ساری عورتیں سر ہلا ہلا کر کہہ رہی تھیں کہ میں کتنی غیر ذمہ دار لڑکی ہوں ۔ میں چپ چاپ کھڑی آس پاس لگے خوبصورت پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو میری آنسو بھری آنکھوں سے دھندلے دھندلے نظر آرہے تھے۔

جب اماں کو کچھ ہوش آیا تو ہم مسز پاٹھک کی کار میں تھانے کی طرف چلے۔ رنجیت اور سمیر جو باہر چھپ کر دیکھ رہے تھے۔ سائیکلوں پر پیچھے پیچھے ہولئے۔ تھانے میں اماں۔ سیدھی تھانے دار کے دفتر میں گھسی چلی گئیں وہ رو۔ رو کر پکار رہی تھی "پریتی...... پریتی......" کئی پولیس والے ان کی طرف دوڑے' ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلایا۔ پنکھے کو پوری رفتار سے چلا دیا تب کہیں اماں کے حواس کچھ قائم ہوئے۔

"میڈم گھبرائیے مت" شریف پولیس افسر نے نرمی سے کہا۔ "بتائیے کیا بات ہے؟"

"گھبرائیے مت۔!" اماں نے تڑپ کر کہا" آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میں گھبراؤں نہیں۔ جبکہ کسی ظالم' کمینے' بدمعاش نے میری بچی کو اغوا کر لیا ہے۔"

افسر اسپرنگ کی طرح اچھل کر اپنی کرسی پر سیدھا بیٹھ گیا۔ "اغوا!" اُس نے ایک ہٹے کٹے سپاہی کو اشارہ کیا "ملہوترا ذرا تفصیل سے بیان لو۔"

"پریتی میری پیاری۔ پیاری بیٹی......"

"میڈم...... چپ ہو جایئے۔ چپ ہو جایئے۔"

"چلی گئی کہیں"

"کہاں"

"پرام میں تھی"

"پرام میں؟ اُس کا مطلب بہت چھوٹی تھی۔"

"پریتی...... میری پریتی......"

پولیس افسر کا چہرہ اب لال ہو کر پسینے میں بھیگ چکا تھا "دیکھئے میڈم اگر بچی لاپتہ ہے تو ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ایک ایک بات تفصیل سے بتایئے' آرام سے صاف صاف۔"

"میں بتاتی ہوں" میں نے کہا۔ اور جتنا بھی صاف صاف میں بتا سکتی تھی میں نے سارے حالات بتائے۔

"یہ تو بڑی غیر ذمہ داری کی بات تھی۔ تھی نا!" افسر نے مجھے گھورتے ہوئے کہا "اب ہمیں جلدی کرنا چاہیے۔ میں اپنے آدمی کھوج بین کے لئے بھیجتا ہوں۔ کیا بتایا تھا گلابی کپڑے' اور باداری رنگ کی پرام۔ سمجھ گئے ملہوترا؟"

"جی جناب"

بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے گھر جائیں میڈم۔ ہمارے پاس آپ کا فون نمبر ہے جیسے ہی کوئی خبر ملے گی۔ میں آپ کو اطلاع دوں گا۔ پولیس افسر نے بہت نرمی سے امّاں کو سمجھایا۔ وہ دروازے تک ہمیں چھوڑنے بھی آیا۔ اور چلتے چلتے پھر بولا "ہمت سے کام لیں میڈم......ہمت سے کام لیں۔"

ہم کار سے گھر آگئے' رنجیت اور سمیر پیچھے۔ پیچھے لگے رہے۔ بیچارے۔ گھر پہنچے ذرا سی دیر ہی ہوئی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ ہمارے گھر کے برابر کی پڑوسن مسز ڈوٹی فرانسس تھیں امّاں ان سے لپٹ کر رونے لگیں۔ "پریتی میری پریتی۔ کھو گئی۔ اغوا کرلی کسی نے۔"

مسز فرانسس کو ہم بہت دنوں سے جانتے تھے ہمارا اور ان کا گھر ملا ہوا تھا۔ وہ امّاں کی پکی دوست تھیں۔ مگر اُس پکی دوست نے اس بار جو کچھ کیا وہ کوئی تعریف کے قابل بات تو نہیں تھی۔ وہ ایسے وقت مسکرا رہی تھیں' جب امّاں انھیں اپنی دکھ بھری داستان سنا رہی تھیں۔ مگر وہ سچ مچ مسکرا رہی تھیں اور جب ہم ان کی طرف حیرانی دیکھنے لگے تو وہ کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ "پریتی کہیں دور نہیں گئی ہے۔ مائی ڈیر" انھوں نے کہا۔ اور سامنے کے بڑے دروازے کے پیچھے جا کر پرام کو اندر لے آئیں۔ جس پر پریتی لیٹی' ہمک رہی تھی اور زور زور سے ہاتھ ہلا رہی تھی۔

دس منٹ تک اُسے گلے سے لگا کر پیار کرنے کے بعد امّاں نے پوچھا "ڈوٹی تمھیں یہ کیسے ملی؟"

"یہی تو راز کی بات ہے۔" مسز فرانسس نے تفصیل سے سمجھایا۔ "میں روزانہ کی طرح پارک میں ٹہلنے گئی تھی۔ جب میں نے پیڑ کے نیچے پرام کھڑی دیکھی تو پریتی رو رہی تھی۔ مجھے لگا وہ بھوکی ہے کیونکہ سب بچے پتنگ اڑانے میں مگن تھے۔ اس لئے میں اُسے گھر لے آئی۔ دودھ پلایا اور تمھارا انتظار کرنے لگی۔"

"ہائے تم کتنی پیاری دوست ہو۔" امّاں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
پریتی کے ملنے کی کچھ ایسی خوشی تھی کہ میں یہ بھی بھول گئی کہ مجھے اُس وقت مسز فرانسس پر غصہ آرہا تھا۔ انھوں نے ہمیں کیوں نہیں بتایا کہ وہ پرام لے جارہی ہیں۔
سمیر نے سب کو یاد دلایا۔ "پولیس ابھی تک تلاش کر رہی ہوگی۔"
امّاں نے میری طرف دیکھا۔ اچھا یہ ہے کہ تم ہی پولس افسر کو فون کرکے سمجھاؤ۔ کیونکہ تمھاری وجہ سے ہی ہم سب جھنجھٹ میں پھنسے ہیں۔"
میں نے تھانے فون ملایا۔
"نمستے سر۔ میں انجو بول رہی ہوں۔ جی ہاں' جی ہاں' پریتی کی بہن۔ پریتی واپس آگئی ہے۔ نہیں نہیں خود چل کر نہیں' پرام میں لیٹی ہوئی۔" میں نے انھیں ساری بات سمجھائی۔
جب ہم لوگ کھانے کے کمرے میں بیٹھے۔ اپما اور کیلے کھا رہے تھے تو سمیر نے کہا "آج میں نے ایک بات سیکھ لی۔ بچے سنبھالنے کے لئے پوری توجہ اور پورا وقت دینا پڑتا ہے۔"
میں نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ چائے ختم ہو گئی تھی۔ ہم لوگوں نے باہر دوڑ لگائی۔ پتنگ بازی کے مقابلے میں جیتنے کی خوشیاں منانے کے لئے۔ اُس جیت کو ابھی صرف دو گھنٹے ہی تو ہوئے تھے۔
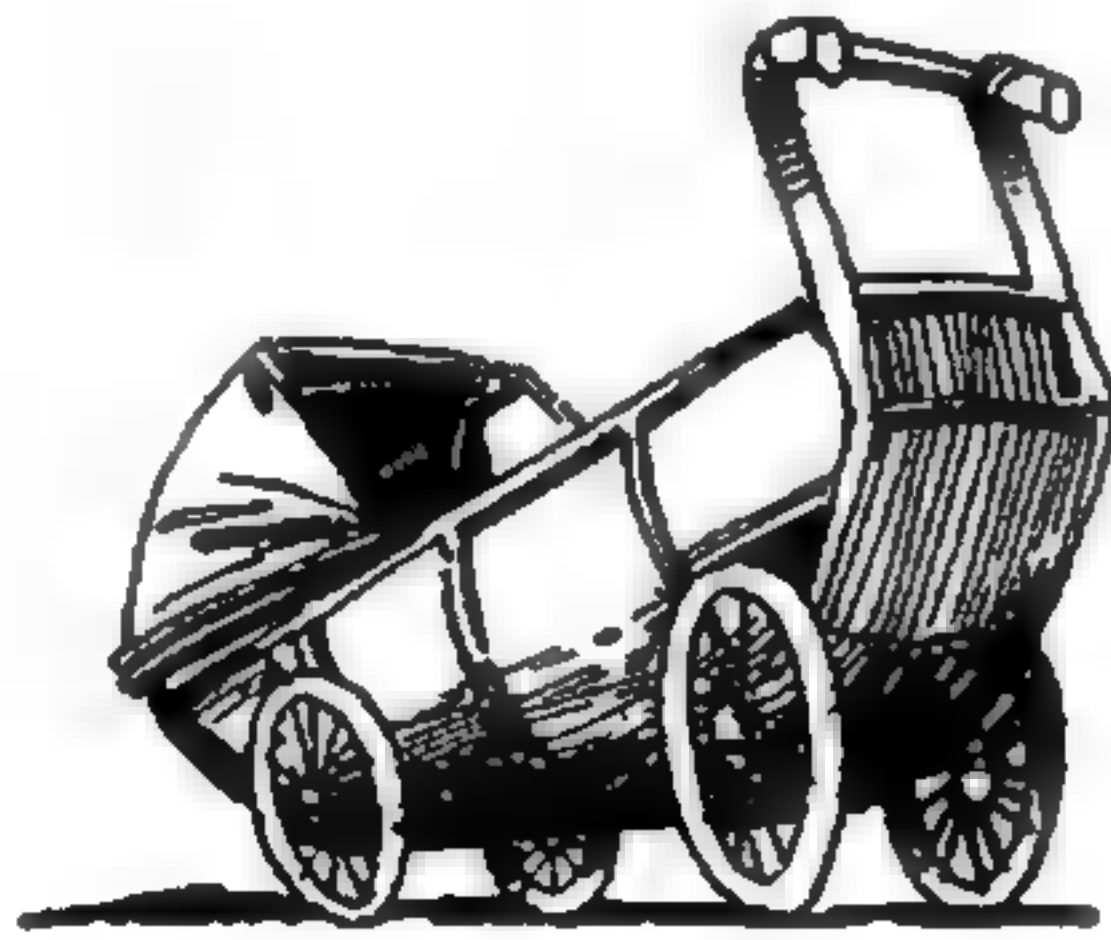
نیا کرائے دار

فلیٹ نمبر 4C میں جو نیا کرائے دار آیا ہے وہ اسمگلر ہے۔ رتن کو اس بات کا پکا یقین تھا۔ اُس کی کالی کالی سیدھی بھنویں تھیں اور کبھی کبھی اتفاق سے اگر وہ مسکراتا تو اُس کے ٹیڑھے میڑھے دانت دکھائی دینے لگتے۔ بالکل 'موتی موتی' فلم کے ویلن کی طرح۔ رتن نے سوچا اور پھر اُس کا سامان بھی کتنا کم تھا۔ ایک چارپائی' ایک میز' دو کرسیاں' اور ایک اسٹیل کی الماری۔ رتن کے لبّا تو یہ سامان اکیلے ہی اٹھا سکتے تھے۔ بس الماری چھوڑ کر۔ یہ سامان اٹھوانے کے لیے اُس نے صرف مالی کو بلایا تھا۔

لفٹ کے صرف دو چکروں اور سیڑھیوں کی طرف سے بس ایک چکر میں سارا سامان اوپر پہنچ گیا۔ گھر میں رکھے جانے کے بعد یہ سامان کتنا کم لگ رہا تھا۔ اتنا کم کہ دیکھ کر شرم آئے۔ رتن کو بلڈنگ کے دوسرے ڈرائنگ روم یاد آئے۔ 2A کے بھاسکر کے ڈرائنگ روم کی وہ بڑی بڑی کرسیاں اور ڈھیروں کتابیں۔ اور اُس کے گھر سے اگلے دروازے والے گوپی کا ڈرائنگ روم۔ فلیٹ نمبر 4B' کا' کتنا خوبصورت ہے۔ لال قالین جس میں پیر سیدھے اندر چلے جائیں۔ بڑے بڑے شاندار صوفے اور اتنا بڑا ٹی۔وی جسے اٹھانے کے لئے چھ آدمیوں کی ضرورت پڑے۔

اُس کے علاوہ ایک سوال اور بھی تھا۔ یہ نیا کرائے دار اُسی بلاک میں کیوں رہنا چاہتا ہے؟ اُس کے ساتھ تو بال بچے بھی نہیں ہیں۔ وہ تو آرام سے سامنے والے نیل گری اپارٹمنٹ میں رہ سکتا تھا۔ جہاں ایک کمرے کے فلیٹ ہیں۔ پھر آخر یہاں اتنے بڑے فلیٹ میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ جس میں تین کمرے ایک ڈرائنگ' ڈائننگ اور دو باتھ روم ہیں؟ دو باتھ روم سوچو ذرا۔

"شاید وہ ایک کمرے میں اپنی چپلیں رکھے گا اور دوسرے میں جوتے......" بھاسکر نے کہا۔ پنّا نے بھی ٹکڑا لگایا۔ "اپنی شرٹ کی ایک آستین ایک کمرے میں اور دوسری دوسرے کمرے میں۔"

مگر رتن کو یقین تھا کہ یہ سب غلط سوچ رہے ہیں۔ یہ آدمی چور ہے اور وہ پولس سے چھپنے کے لئے یہاں آیا ہے۔ کیا یہ چھپنے کے لئے بہترین جگہ نہیں ہے! ایک ایسا بڑا بلاک جس میں سب بال بچوں والے ہی رہتے ہیں۔ جیسے 'ایک ہیرا' فلم میں اسمگلر تھا۔

"تمھارے ساتھ چکر یہ ہے کہ تم فلمیں بہت دیکھتے ہو۔ تمھیں لگتا ہے ساری دنیا چوروں اور سپاہیوں سے بھری ہوئی ہے۔" بھاسکر کی بہن بینا نے کہا۔

ویسے تو بینا کی معلومات اچھی تھی۔ وہ نویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ وہ تو مینڈک کا پیٹ چیر کر دیکھ چکی تھی۔ اور بتاتی تھی کہ مینڈک بھی اندر سے آدمی کی طرح ہی ہوتا ہے۔ مگر ہر آدمی کو ہر بات پتہ ہو کیا یہ ہو سکتا ہے؟ اسی طرح بینا کو بھی بہت سی باتیں پتہ نہیں تھیں۔ جیسے اُسے نہیں معلوم تھا کہ یہ نیا کرائے دار ایک بُرا آدمی ہے' چور ہے' اسمگلر ہے' صرف 'موتی موتی' فلم میں ہی نہیں کئی اور فلموں میں بھی بالکل اسی جیسا ویلن تھا۔ جیسے 'ڈاکو اور چور' اور ہاں وہ 'خون' میں تھا نا۔ اب اس بات میں کوئی شک نہیں ہے۔ ثبوت؟ وہ کون سی بڑی بات ہے؟ رتن بہت جلد ثبوت لے آئے گا۔ بچوں کی فلم 'فیصلہ' کے ہیرو چندن نے بھی تو یہی کیا تھا۔ جب چندن کر سکتا ہے تو رتن بھی کر سکتا ہے۔

مگر بچوں کی فلم کا ہیرو بننا ایسا آسان بھی نہیں تھا۔ ہیرو چندن کے پاس تو ہمیشہ بہت وقت ہوتا تھا چوروں کا پیچھا کرنے کے لئے' بلکہ کبھی کبھی تو چور خود چل کر اُس کے پاس آجاتا تھا تاکہ اُس کا پیچھا کیا جائے۔ مگر رتن کے لئے سارے حالات دوسرے تھے۔ بیچارہ رتن جب بھی اوپر کسی فلیٹ میں جا کر اُس آدمی کی جاسوسی کرنا چاہتا کوئی نہ کوئی اُسے آواز دے لیتا۔ بھاسکر کی اماں کہتیں "رتن بھاسکر سے کہہ دو فوراً گھر آجائے۔" یا پھر گوپی کی اماں بلا کر کہتیں۔ "جلدی سے ایک کلو گھی لادو۔" اور کوئی نہیں تو اُس کے اپنے ابا چلاتے۔ "رتن بیٹا یہ کپڑے 5 ڈی لے جاؤ دھوبن بھول گئی انھیں یہاں۔"

کوئی اُس کی مدد بھی نہیں کرتا تھا۔ بھاسکر تک کہتا تھا "چھوڑو یار آؤ کرکٹ کھیلیں' تم چاہو تو تم فیلڈنگ کر سکتے ہو۔" اور وہ موٹا گوپی اپنی بالکنی میں کھڑا ہو کر جب بھی رتن کو دیکھتا تو اُسے چھیڑتے ہوئے آواز لگاتا۔ "ارے کتنے چور پکڑ لیے تو نے؟ کیا کل کے اخباروں میں یہ خبر چھپنے والی ہے؟ چوکیدار کے بہادر بیٹے نے اسمگلر پکڑا۔"

مگر رتن ہار ماننے والا نہیں تھا۔ ہیرو لڑکے کبھی ہار نہیں مانتے۔ وہ انتظار کرتے ہیں۔ کئی کئی دن تک انتظار کرتے ہیں۔

ایک دن دوپہر میں وہ آدمی جلدی آگیا۔ عام طور پر وہ شام کو چھ بجے کی خبروں کے بعد آتا تھا۔ مگر اُس دن بھاسکر اور دوسرے سبھی ساتھیوں کے اسکول سے واپس لوٹنے سے پہلے ہی آگیا۔ رتن گیٹ کے پاس بیٹھا تھا جب وہ واپس آیا۔ وہ آدمی اُس کے پاس سے نکل گیا۔ مگر پھر مڑا اور کچھ پیسے نکال کر بولا "اے لڑکے۔ کیا تم مجھے ایک پیکٹ سگریٹ لا دو گے؟ اوپر 4۔ سی میں پہنچا دینا۔ نمبر یاد رہے گا تمھیں؟ 4۔ سی!۔"

"نمبر یاد رہے گا" ارے یہ نمبر تو رتن کو اچھی طرح یاد تھا۔ 4۔ سی اسمگلر کا گھر۔ 'جی ہاں انسپکٹر صاحب' وہ فلیٹ نمبر 4۔ سی میں ہے۔ نہیں۔ جناب وہ بھاگ نہیں سکتا۔ میں نے دروازہ باہر سے بند کر دیا ہے......!'

پانچ منٹ بعد رتن سگریٹ کا پیکٹ لیے لفٹ میں اوپر جا رہا تھا۔ ہیرو چندن کی طرح بھویں سکیڑے، ہونٹ اتنی کس کر بھینچے کہ اس کا منہ ایک پتلی سی لکیر لگ رہا تھا۔ ایک منٹ بعد ثبوت اُس کے ہاتھ میں ہو گا۔ 4۔ سی کے اسمگلر کے بارے میں ثبوت۔ بس پھر اُسے یہی کرنا پڑے گا کہ پولس کو فون کر دے۔ وہ بھاسکر یا پھر گوپی کے گھر جا کر فون کرے گا۔ گوپی کو بھی اچھا سبق ملے گا' جب پولس آئے گی اور......

4۔ سی کا باہر والا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ رتن نے رک کر ماتھے سے پسینہ پونچھا' جیسے ہیرو ولین کا سامنا کرنے سے پہلے کیا کرتے ہیں۔

دیوار سے کمر لگا کر ہاتھ اِدھر اُدھر پھیلا کر گردن موڑ کر' منہ کندھے کی طرف گھمائے' رتن دبے پاؤں چلتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ کیا سننے کو ملے گا؟ کیا دیکھنے کو مل سکتا ہے؟ وہ آدمی فون کر رہا تھا۔ رتن کو فون کا ڈائل گھومنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر ذرا دیر خاموشی رہی۔ پھر اُس آدمی کی آواز آئی۔ "ہاں بھیج دو" بس صرف اتنا ہی۔

پھر کسی اور چیز کی آواز نہیں تھی۔ سوائے رتن کے دل کی دھڑکنوں کی آواز کے۔ اس کا

مطلب اُس کا اندازہ اب تک ٹھیک تھا۔ یہ آدمی اسمگلر ہے۔ رتن نے سوچا شاید اُسے ایک گھڑی انعام میں ملے گی۔ وہ ہمیشہ سے ایک باہر کی...... 'فورین گھڑی' چاہتا تھا کیونکہ دوسری کسی قسم کی گھڑی سے اسے ٹائم دیکھنا نہیں آتا تھا۔ اب شاید اُسے............

"اے لڑکے۔ تم کیا کر رہے ہو یہاں۔" گوپی کے ابّا نے بلڈ سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ چوری کرنا چاہتے تھے؟ میں نے پکڑ لیا تمھیں۔"

"مگر...... میں...... میں...... میں...... رتن نے ہکلاتے ہوئے ان کی پکڑ سے نکلنے کی کوشش کی۔ گوپی کے ابّا نے اُسے اور کس کر پکڑ لیا۔ رتن نے تڑپ کر نکلنا چاہا مگر سب بیکار تھا۔ چندن ہیرو تو ایسے موقعے پر لات مار کر نکل بھاگتا مگر وہ بھلا یہ کیسے کر سکتا ہے' رتن گوپی کے ابّا کو لات مار سکتا ہے بھلا؟ ناممکن۔ 4۔ سی کا دروازہ پورا کھلا اور اُس آدمی نے باہر جھانکا۔

"میں نے اس چھوٹے لڑکے کو پکڑ لیا ہے۔" گوپی کے ابّا چلائے۔ "یہ آپ کو لوٹنا چاہتا تھا۔ میں پہلے سے جانتا ہوں' یہ کسی لائق نہیں۔ یہ......"

وہ آدمی ہلکے سے مسکرایا اُس کے ٹیڑھے میڑھے دانت دکھائی دیئے۔ رتن سچ مچ ڈر گیا۔ اب کیا ہوگا؟ شاید وہ آدمی اُسے فلیٹ میں لے جا کر کراٹے کا ہاتھ یا کچھ اور استعمال کر کے مار ڈالے گا۔ اگر وہ گوپی کے ابّا کو اُس آدمی کے بارے میں بتادے اور یہ بھی بتادے کہ اُس نے فون پر کیا بات کی ہے تو شاید......

مگر وہ آدمی کیا کہہ رہا ہے؟ "ارے اس کو جانے دیجئے۔ یہ اچھا لڑکا ہے۔ یہ میرے لئے سگریٹ لے کر آیا ہے۔ میں اسی انتظار کر رہا تھا۔ بس اتنی سی بات......؟"

گوپی کے ابّا نے رتن کا بازو چھوڑ دیا "ٹھیک ہے اگر آپ کو یقین ہے تو......" وہ بڑبڑائے۔

اُس آدمی نے رتن سے سگریٹ اور باقی بچے پیسے لیے اور ایک بار پھر مسکرایا۔

"تم اچھے لڑکے ہو۔ ہے نا! کیا تم مجھ سے کراٹے سیکھو گے؟"

رتن نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ "ہاں" اُس نے بہت آہستہ سے کہا۔

گوپی کے ابّا غرائے۔ "تو اب یہ بھی اِدھر اُدھر لوگوں کو مارتا پھرے گا۔" وہ آگے اور بھی کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن ایک دم نیچے سے چیخ پکار سنائی دی۔ اور بہت سے پیروں کی سیڑھی پر چڑھنے
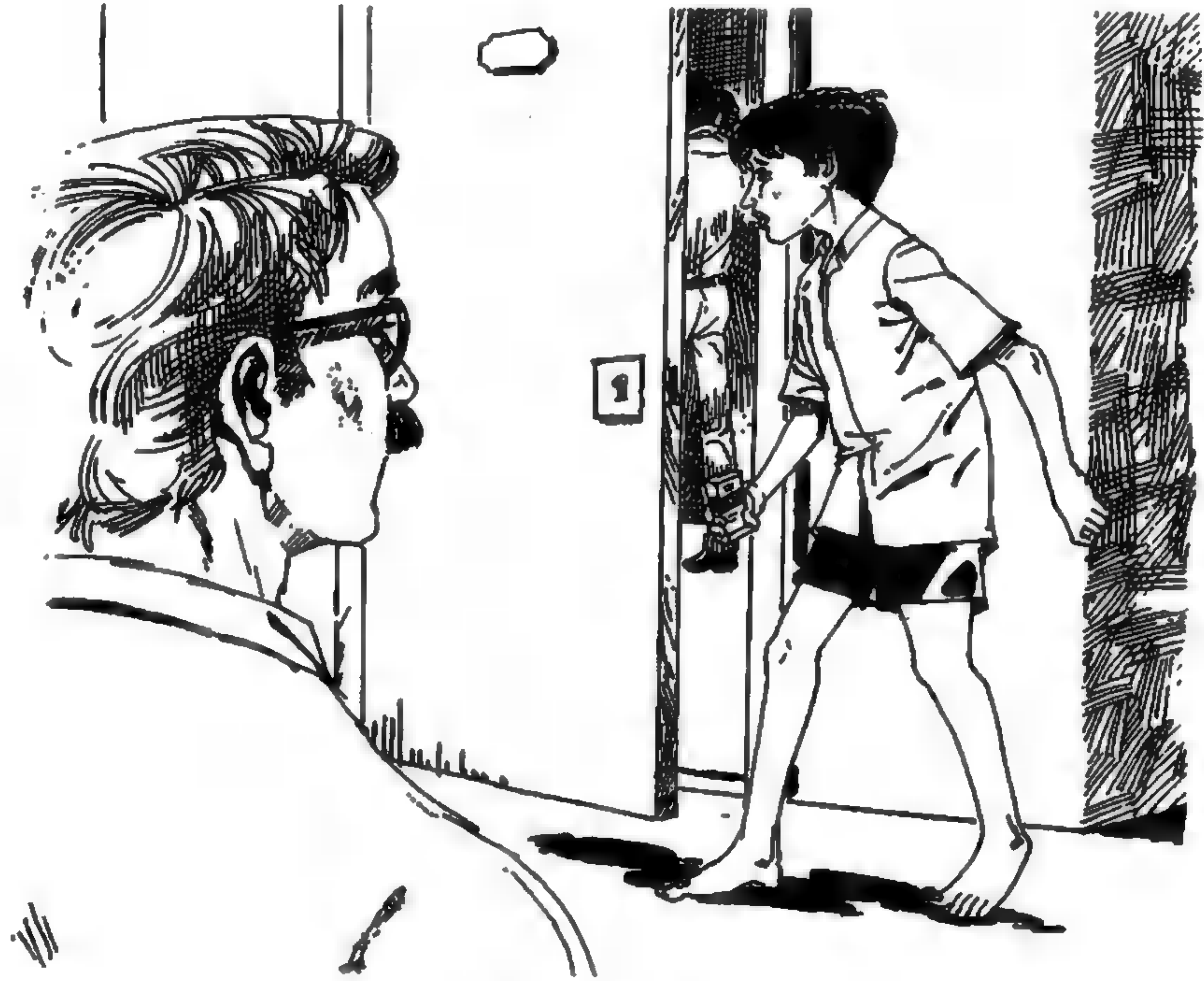
کی آوازیں سنائی دیں۔ دروازے دھڑا دھڑ کھلنے لگے۔ "پولس!" کوئی چلایا۔

'پولس!' اتنی جلدی؟' اُس نے تو ابھی فون بھی نہیں کیا پولس کو۔ اب کیا ہوگا؟ کیا وہ اُس آدمی کو پکڑ کر لے جائیں گے۔ A۔ سی والے آدمی کو۔ پھر اُسے کراٹے کون سکھائے گا؟ سب ہیرو لڑکوں کو کراٹے ضرور آنا چاہیے۔ چندن کو بھی آتا ہے۔

پولس اب دوسری منزل پر آگئی تھی' پھر تیسری پر...... 'کیا وہ وہاں رکنے والے ہیں؟ نہیں اوپر چڑھ رہے ہیں' اب وہ چوتھی منزل پر آگئے۔' اور پھر وہ رک گئے۔

اُن میں سے ایک آدمی نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کیا وہ ہتھکڑیاں نکال رہا ہے؟ رتن بنا ہلے جلے چپ کھڑا رہا۔ اب وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ پر کیا وہ کوشش کرے؟ اُچھل کر' پولس والے کے پیٹ میں ٹکر مارے؟

' مگر یہ کیا؟' پولس والے نے ہتھکڑیوں کے بجائے جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا اور وہ اُسے گوپی کے ابّا کو دکھا رہا ہے۔ اور اچانک گوپی کے ابّا 'دودھ روٹی' کے ساہوکار کی طرح لگنے لگے۔ انھوں نے ہاتھ جوڑ لیے اور پولس والے سے کچھ کہہ رہے ہیں۔ مگر کوئی ان کی بات نہیں سُن رہا۔ ایک پولس والے نے 4۔بی کی گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھلا اور وہ سب اندر چلے گئے۔ اندر سے گوپی کی امّاں کے رونے کی آواز آنے لگی۔

بعد میں بھاسکر نے بتایا کہ وہ کچھ انکم ٹیکس کا معاملہ تھا۔ اُس نے سمجھایا "گوپی کے ابّا بھی ایک طرح کے چور تھے۔ پولس والے بہت رات کو گوپی کے گھر سے نکلے۔ مگر کوئی بھی گوپی کے ابّا سے بات کرنے نہیں گیا۔ جبکہ ساری بلڈنگ جاگ رہی تھی۔ بچے تک جاگے ہوئے تھے۔

"معاف کرنا ہم نے تم پر شک کیا۔" بینا نے کہا۔ "مگر تم ایسے ہی سوچتے رہو کہ آنے والا ہر نیا کرائے دار اسمگلر ہے۔ ہو سکتا ہے اگلی بار پولس اُسے پکڑنے آجائے۔"

مگر بینا اس بار بھی غلط سوچ رہی تھی۔ اُسے مینڈکوں کے بارے میں بہت کچھ پتا تھا۔ مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ 4۔سی کا کرائے دار بالکل اُس نئی فلم کا جاسوس لگتا ہے جو اگلے ہفتے 'پائینر سنیما' میں لگنے والی ہے۔ رتن نے ابھی ابھی اُس کے پوسٹر دیکھے ہیں۔

ننھی گوریاں

'چک...... چک...... چک...... چک'

سیٹی جیسی باریک آوازوں کے شور سے نند تیا کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے پلنگ کے برابر رکھا لیمپ جلایا۔ چاروں طرف پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ سائیں سائیں کرتے ہوئے پَر اُس کے سر کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ "اوہ تم لوگ ہو۔" نند تیا نے پردے کے اوپر جا بیٹھی دو گوریوں سے کہا۔ "اتنی صبح صبح چہکنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے سونے دو۔" ایک چڑیا نے شرارت سے آنکھ جھپکائی اور اڑ کر دوسری کھڑکی پر جا بیٹھی۔ دوسری چڑیا نے بھی اُس کی نقل کی۔

'چک...... چک...... چک...... چک' دونوں مسلسل چہچہاتی رہیں۔ آخر او گھتی ہوئی لڑکی کو اپنے آرام دہ بستر سے اٹھنا ہی پڑا۔

"ہش...... ہش...... ش" اُس نے شور مچاتے ہوئے دوڑ کر کھڑکیاں کھولیں تاکہ ان ہلڑ بازوں کو باہر نکال دے۔ جب تک وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوتی نند تیا پوری طرح جاگ چکی تھی۔ اس کی کھڑکی کے باہر دھندلی دھندلی روشنی پھیل رہی تھی۔ پو پھٹنے لگی تھی۔

'اب سونے کا کوئی فائدہ نہیں۔' اُس نے سوچا نیند تو خراب ہو ہی گئی ہے۔ اب اسکول کے لئے تیار ہو لیا جائے۔ جب ماں اسے اٹھانے آئیں گی تو یہ دیکھ کر وہ بہت حیران اور خوش ہوں گی کہ وہ پہلے ہی کپڑے پہن کر تیار ہے۔ کئی گھنٹے بعد جب نند تیا اسکول سے لوٹی تو اُس نے ماں کو اپنے کمرے میں پایا۔ وہ بہت ناراض لگ رہی تھیں۔

"کیسی مصیبت ہیں یہ گوریاں بھی۔" انھوں نے شکایتی انداز میں کہا۔ "میں نے تمھارا کمرہ ابھی تھوڑی دیر پہلے صاف کیا تھا۔ مگر دیکھو انھوں نے پھر کیسی گندگی پھیلائی ہے۔"

کھڑکی کے پردے کے نیچے سوکھی گھاس، ننھی منی ٹہنیوں اور پتیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ اصل میں

وہ اپنا گھونسلا بنا رہی تھیں۔

"وہ انڈے کہاں دیں گی؟ ان کا گھونسلا نہ اجاڑیئے۔" نند تیا نے بے چین ہو کر کہا۔

"مطلب کیا ہے تمہارا" ممی کو غصہ آگیا "کیا تم چاہتی ہو کہ گھر گندا ہو جائے۔" انھوں نے جھاڑو سے سارا کوڑا صاف کر دیا۔

نند تیا نے سوچا ممی بھی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ مگر اُسے گوریوں پر بہت ترس آرہا تھا۔

رات کو جب وہ اپنے نرم بستر میں لیٹی تو نند تیا کی نظر اوپر گئی گوریاں کہاں ہیں؟ اُس نے دیکھا وہ پردہ ٹانگنے کے پیلمٹ کے ایک کونے میں سکڑی بیٹھی ہیں۔ اُن کے سینے پھولے ہوئے ہیں اور سر نیند سے جھکے ہوئے ہیں۔

'بیچاری......' نندیتا نے پھر سوچا۔ جب بھی یہ گھونسلا بناتی ہیں ہم اٹھا کر پھینک دیتے ہیں۔ یہ کہاں رہیں گی۔'

اپنے بستر پر لیٹے لیٹے گوریوں کو دیکھتے دیکھتے اُس کے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔

'پرانا گڑیا گھر' ٹھیک رہے گا۔'

پچھلی گرمیوں کے بعد سے اُس نے گڑیاں کھیلنا چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ اُس زمانے میں اُس کے چچازاد بھائی بہن چنٹو اور لیلا اُس کے گھر آئے ہوئے تھے اور وہ دونوں گڑیاں کھیلتے دیکھ کر اُس کا مذاق اڑانے لگے تھے۔

"نند تیا کو دیکھو" چنٹو نے اُس کی میز پر رکھے گڑیا گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جملہ کسا تھا۔ "نو سال کی ہو گئی مگر ابھی تک گڑیاں کھیلتی ہے۔ دیکھو اُس کے پاس گڑیا گھر بھی ہے۔" اُس نے ایسی حقارت سے یہ جملہ کہا تھا کہ نند تیا کو بہت شرم آئی تھی۔

"میں تو کبھی گڑیوں سے نہیں کھیلتی۔" لیلا نے اینٹھ کر کہا۔ "ہم تو بس بڑوں والے کھیل کھیلتے ہیں۔ ہے ناں چنٹو؟ جیسے کیرم لوڈو تاش۔"

نند تیا خاموش رہی۔ وہ اپنے چچازاد بھائی بہنوں کو یہ بھی نہیں بتا پائی کہ اُس کے ساتھ کھیلنے والا گھر پر کوئی نہیں ہے۔ اس کے نہ کوئی بھائی ہے نہ بہنیں۔ تو پھر لوڈو اور کیرم جیسے کھیل اکیلے کیسے

کھیل سکتی ہے؟

مگر اُس وقت یہ سب ان لوگوں کو سمجھانے کے بجائے وہ اپنے کھلونے چھپانے دوڑ گئی تھی۔

"ارے یہ گڑیا گھر تو میں بس تم لوگوں کو دکھانے کے لئے نکالا تھا۔" اُس نے بات بنائی۔ "میں بھی اس سے نہیں کھیلتی۔" اور اُس نے چنٹو کے انداز میں مذاق اڑانے والا قہقہہ لگایا۔ بعد میں اُس نے گڑیا گھر کو برتنوں کی الماری کے ایک کونے میں ڈال دیا جہاں وہ آج تک پڑا دھول پھانک رہا ہے۔

ترکیب اُس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ کود کر اپنے بستر سے اتری' لائٹ جلائی اور الماری میں سے گڑیا گھر نکال لیا۔ اُس کی دھول جھاڑ پونچھ کر اُسے پھر میز پر رکھ دیا۔ اپنی لال لال چھت اور کریم کلر کی دیواروں کی وجہ سے گڑیا گھر کتنا خوبصورت لگ رہا تھا۔ 'کتنی بُری بات ہے کہ ایسے پیارے کھلونے کو ایسے ہی پھینک دیا جائے۔'

اُس نے گڑیا گھر کے دروازے کھولے اور سب کمروں میں جھانکا۔ اوپر کی منزل کا کمرہ چڑیوں کے لئے اچھا رہے گا۔ 'مگر پہلے کمرے سے سامان تو نکالا جائے۔ ننھے منے پلنگ' سنگھار میز اور صوفہ تو ہٹانا ہی پڑے گا۔ اور ان جھالردار پردوں کی بھی اب ضرورت نہیں۔'

"لیجئے آپ کا کمرہ تیار ہو گیا۔" ننھ تیا نے گوریوں کو پکارا۔ "تم لوگ میرے مہمان ہو۔ یہاں اپنا گھونسلا بنالو۔ گوریوں نے نیند میں آنکھیں جھپکائی پر اپنی جگہ سے نہیں ہلیں۔ "جاگو اے سونے والو! آؤ اور اپنے نئے گھر کا معائنہ کرو۔"

جب پھر بھی وہ نہیں آئیں تو ننھ تیا وہ لمبا بانس لینے دوڑی جس پر اُس کی اماں نے چھت کے جالے صاف کرنے کے لئے جھاڑو باندھ رکھی تھی۔ اُس نے چڑیوں پر جھاڑو لہرائی "ہش۔ ہش۔"

گوریاں اڑیں مگر' بس دوسرے پردے کے اوپر جا کر بیٹھ گئیں۔

"وہاں نہیں۔ یہاں اے بے وقوف چڑیو!" ننھیا چڑیوں کے پیچھے بھاگنے لگی۔ وہ زبردستی انھیں نئے گھر میں گھسانا چاہتی تھی۔

گوریاں سارے کمرے میں چکر لگا رہی تھیں۔ الماری کے اوپر سے اڑ کر میز پر آبیٹھیں۔ میز سے کھڑکی پر' کھڑکی سے دروازے پر' دروازے سے واپس پھر کھڑکی پر۔ اور ان کے پیچھے اپنی جھاڑو

لئے نند تیا لگی ہوئی تھی۔ کبھی پلنگ پر کودتی۔ کبھی کرسی سے لڑکھڑاتی تو الماری سے جا ٹکراتی۔

'دھم۔ دھڑام۔ دھائیں۔ دھاڑ۔'

یہ آوازیں سُن کر اُس کی ماں گھبرائی ہوئی بھاگ کر کمرے میں آئیں۔ بند دروازے سے ٹکر کھائی۔ "چور...... چور" وہ چلائیں۔ "کھولو کھولو کیا ہو رہا ہے یہاں؟"

ننھتیا نے چڑیوں کا پیچھا چھوڑ کر دروازہ کھولا۔ اُس کی ماں نے کمرے میں اِدھر اُدھر بکھری چیزوں کو گھور کر دیکھا۔ "نند تیا تم کیا کر رہی ہو؟ اتنی دیر رات میں!؟"

نند تیا نے انھیں ساری بات بتائی۔

"کتنی بے وقوفی کی بات ہے۔ گڑیا کے گھر میں گھونسلا! ناممکن" می نے چلا کر کہا۔

"بالکل بے وقوفی کی بات نہیں ہے۔ آپ دیکھتی رہئے میں بنا کر رہوں گی۔ نند تیا نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ صبح کو کوشش کر لینا۔ یہ کوئی وقت نہیں ہے ایسے بے وقوفی کے تجربے کرنے کا۔" می نے ڈانٹ کر کہا اور لڑھکی ہوئی کرسی کو سیدھا کیا۔

سویرے نند تیا نے گڑیا گھر کے فرش پر دال اور چاول کے دانے بکھیر دیئے۔ اُسے امید تھی کہ دانوں کے لالچ میں چڑیاں گڑیا گھر میں گھسیں گی۔ چڑیوں نے فوراً دانے ڈھونڈ لیے اور پھدک پھدک کر گڑیا گھر میں آنے جانے لگیں وہ جلدی جلدی اپنی چونچوں سے دانے ٹونگ رہی تھیں۔

نند تیا نے میز پر ایک پرانا اخبار بچھا دیا۔

"اب گندگی نہیں پھیلے گی سمجھیں نا" اُس نے چڑیوں سے کہا "امید ہے جب میں اسکول سے آؤں گی تو تم لوگ آرام سے اندر بیٹھی ہو گی۔"

مگر اتنا آسان نہیں تھا کہ چڑیوں کو گڑیا گھر میں گھونسلا بنانے کے لئے تیار کر لیا جائے۔ نند تیا نے بہت محنت کی۔

وہ روز گڑیا گھر میں کھانے کی مزے دار چیزیں بکھیر دیتی۔ چڑیاں مزے لے لے کر کھاتیں مگر پھر بھی وہ اپنا گھونسلا پردا ٹانگنے والی سلاخ (راڈ) پر ہی بنانے میں لگی رہیں۔ روزانہ می ان کا گھر بنانے کا سامان اُٹھا کر پھینک دیتیں۔ جس میں دونوں چڑیوں کے جمع کیے ہوئے تنکے 'پتیاں' ننھی ننھی

ٹہنیاں اور دوسرے فالتو چیتھڑے شامل ہوتے۔ اُسے ان بے وقوف چڑیوں کی عقل پر رونا آتا' جو اتنے خوبصورت گھر میں رہنے کی دعوت قبول نہیں کر رہی تھیں۔

اُس نے تو گویا گھر کو اُٹھا کر الماری کے اوپر پیلٹ کے پاس تک رکھا جہاں عام طور پر چڑیاں آکر بیٹھتی تھیں۔

"دیکھو میں تمھارا گھر تمھارے پاس لے آئی ہوں۔"

مگر اُس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ چڑیاں ویسے ہی بے وقوفوں کی طرح تنکے لالا کر پردے کی راڈ پر جمع کرتی رہیں۔ جہاں سے اماں انھیں اُٹھا اُٹھا کر پھینکتی رہیں۔

اور بس پھر نند تیا کی نظر اُس کی ردی کی ٹوکری میں پڑی ہوئی سوکھی گھاس پر پڑی۔ جو اُس کی اماں نے وہاں ڈال دی تھی۔ اُس کے دماغ میں ایک اور ترکیب آئی۔ اُس نے وہ کوڑا اٹھا کر پیار سے گویا گھر کے اوپر والے کمرے میں جمادیا' کیسا آرام دہ گھونسلا تیار ہو گیا ہے۔'

"دیکھو میں نے تمھارا گھونسلا تیار کر دیا ہے۔ اب کیا تم یہاں لیٹو گی۔؟"

چڑیوں نے اُس کی طرف ایسے دیکھا جیسے اُس کی بات توجہ کے لائق ہی نہیں۔ نند تیا نے انھیں سوچنے کا وقت دیا۔ دو دن بعد اُس نے دیکھا کہ وہ اب تک پردے کی راڈ پر ہی جمی ہوئی ہیں۔ گویا گھر ویسے ہی خالی پڑا ہے۔

"ٹھیک ہے۔ میں ہار گئی۔ اب تم جانو تمھارا کام۔ اگر تم یہی چاہتی ہو کہ تمھارے بال بچے ہونے تک تمھارے پاس کوئی گھر نہ ہو تو چلو یوں ہی سہی۔" نند تیا نے گوریوں کو سخت الفاظ میں ڈانٹ پلائی۔

وہ اپنے اسکول اور پڑھائی میں لگ گئی اور ان دو گوریوں کو بھول گئی۔ ایک دن جب وہ اسکول سے لوٹی تو اُس نے دیکھا کہ پڑوسی لڑکا آم کے پیڑ پر بیٹھے کوے کو پتھر مار رہا ہے۔

"ارے دیپک کیا کر رہے ہو تم۔ ایسے پتھر مت پھینکو۔ ابھی میرے لگ جاتا۔" اُس نے دیپک سے کہا۔

دیپک ہنس دیا۔ "سامنے مت آؤ میں نشانہ لگانے کی پریکٹس کر رہا ہوں۔"

"تو کسی اور چیز پر نشانہ لگاؤ۔ بیچارے کوے کو کیوں مار رہے ہو؟"

"اُس نے مینا کے بسکٹ جھپٹ لئے ہیں۔" مینا دیپک کی چھوٹی بہن تھی۔

اگلے دن نند تیا نے دیکھا دیپک ایک کُتے کو دوڑا رہا ہے۔ اُس نے ایک پتھر اٹھایا اور کُتے کا نشانہ بنایا۔

"اے دیپک۔ یہ مت کرو۔ اُس بیچارے کے کیوں مار رہے ہو؟" نند تیا نے پوچھا۔

"اُس نے مینا کو ڈرا لیا ہے۔" دیپک نے جواب دیا اور مجھے نشانہ لگانے کی پریکٹس جو کرنا ہے۔ تم سے کیا؟"

نند تیا نے کوئی جواب نہیں دیا' پر اُسے بُرا بہت لگا تھا جب دیپک بیچارے جانوروں اور چڑیوں پر نشانے بازی کی مشق کرتا تھا۔ کیا اُسے نہیں معلوم کہ ان کے چوٹ لگتی ہے۔

اگلے دن جب وہ باہر کھیل رہی تھی تو اُسے خوشی سے کسی کے زور سے چیخنے کی آواز آئی' ساتھ ہی باریک سی چک چک بھی سنائی دی۔ اُس نے دیوار پر سے اُچک کر دیکھا تو نظر آیا کہ دیپک دور کونے میں کسی چیز کی طرف تیزی سے دوڑا جارہا ہے۔

"دیکھا کیا نشانہ ہے" دیپک نے اُسے جھانکتا دیکھ کر چلا کر کہا۔

"سیدھا نشانے پر لگا ہے یار' دیکھا کیسا پکا نشانہ ہے۔"

"کیا ہے؟ کیا مارا ہے تم نے؟" نند تیا نے ہلکے سے پوچھا۔

"گوریا!" دیپک خوشی سے چلایا "وہاں ڈال پر بیٹھی تھی کتنا چھوٹا نشانہ تھا مگر میں نے کیسا تاک کر مارا۔ میرا نشانہ اچھا ہوتا جارہا ہے۔"

اُس نے دوڑ کر نیچی پڑی چڑیا کو اٹھالیا۔ "لگتا ہے یہ تو مر ہی گئی۔ اب مجھے پتہ چلا کہ شکاریوں کو کتنا مزہ آتا ہوگا' شکار میں۔"

نند تیا نے اور کچھ سننے کا انتظار نہیں کیا۔ وہ اپنے گھر کے گیٹ سے دوڑتی ہوئی نکلی اور چلاتی ہوئی دیپک کے گھر میں گھس گئی۔

وہ غصّے میں چلائی۔ "تم جانور ہو۔ تمھارے لیے یہ صرف کھیل ہے بیچاری چڑیا۔ لاؤ اُسے مجھے دو"

دیپک نے ہڑبڑا کر چڑیا چھوڑ دی۔ نند تیا نے اُسے ہاتھ میں لے کر پیار سے چمکارا۔ وہ مری نہیں تھی۔ صرف سکتے میں تھی۔ شاید اُس کے کہیں چوٹ بھی لگی تھی۔ وہ چڑیا کو اپنے کمرے میں لے آئی اور اچھی طرح سے اُس کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کہیں کوئی چوٹ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ بس چڑیا کچھ سہم گئی تھی اور اڑ نہیں پا رہی تھی۔

اُس نرم نرم پروں والی گیند کو ہاتھوں میں دبائے نند تیا کی نظر الماری پر رکھے گُڑیا گھر پر پڑی جس کے اوپر والے کمرے میں تنکوں کے کچھ حصے لٹکے دکھائی دے رہے تھے۔ نند تیا نے جو گھونسلا بنایا تھا وہ اب تک وہاں موجود تھا۔

نند تیا اسٹول پر چڑھ کر گُڑیا گھر کے پاس پہنچ گئی اور بہت احتیاط سے اس نے زخمی چڑیا کو تنکوں پر رکھ دیا۔

"یہاں آرام کرو جب تک تم اچھی نہ ہو جاؤ۔" نند تیا نے اسٹول سے اترتے ہوئے کہا۔ اور پڑھنے کے لیے ایک کتاب نکال لی۔

"چک......چک......" تھوڑی دیر میں آواز آئی۔ اُس نے نظر اٹھا کر دیکھا پردے کی راڈ پر بیٹھا چڑا چہک رہا تھا۔ گُڑیا گھر کے اندر سے زخمی چڑیا نے اُس کو جواب دیا۔

"اچھا تو یہی جوڑا ہے تمھارا۔" نند تیا خوشی سے چلائی۔ اُس نے کتاب پھینک دی اور چڑیوں کو دیکھنے لگی۔ جو ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش تھیں اور چہک چہک کر گا رہی تھیں۔

زخمی چڑیا کچھ دن تک اس قابل نہیں ہو پائی کہ اُڑ سکے۔ وہ وہیں بیٹھی رہی جہاں نند تیا نے اُسے بیٹھایا تھا۔ اب دوسری چڑیا نے بھی گُڑیا گھر میں تنکے جمع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

آخرکار نند تیا کو کامیابی مل ہی گئی۔

اُس کے بعد سب کچھ بہت آرام سے ہونے لگا۔ دونوں چڑیوں کو آخرکار یہ پتہ چل ہی گیا کہ یہ جگہ اپنا گھر بنانے کے لئے اچھی ہے۔ وہ دن بھر گُڑیا گھر میں آتی جاتی رہیں۔ اب بیکار تنکوں سے نند تیا کا کمرہ بھی گندہ نہیں ہوتا تھا۔

اور ایک دن جب نندتیا نے گھونسلے میں جھانکا تو دیکھا کہ تین انڈے تنکوں کے ڈھیر پر رکھے ہیں۔
نندتیا کو بہت خوشی ہوئی اور جوش میں اماں کو بلانے کے لیے ڈرائنگ روم کی طرف دوڑی۔
مگر ایک دم وہ رک گئی۔ اماں کے پاس کچھ ملنے والے آئے ہوئے تھے۔ دیپک اور اس کی اماں۔

"کیابات ہے نند تیا" لماں نے پوچھا۔

"ک...... کچھ...... کچھ...... نہیں......" نند تیا وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر لماں نے اُسے روک لیا۔

"دیپک کو اپنے کمرے میں لے جاؤ وہ یہاں بیٹھا بیٹھا بور ہو رہا ہے۔"

اُسے دیپک کو اندر لانا ہی پڑا۔ چڑیوں کے چک...... چک سن کر اُس نے اوپر نظر اٹھا کر دیکھا۔

"وہ کیا ہے اوپر؟ کیا اس گھر میں چڑیاں ہیں؟ اُس نے پوچھا تو نند تیا کو اُسے انڈوں کے بارے میں بھی بتانا پڑا۔

دیپک بھی انڈوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔

"ٹھیک ہے تم انھیں توڑنا یا چھونا نہیں" نند تیا کو بہت فکر تھی مگر یہ دیکھ کر اُسے بہت تعجب ہوا کہ دیپک بہت حیرت سے گھونسلے میں رکھے انڈوں کو دیکھ رہا ہے۔

"کتنے پیارے لگ رہے ہیں؟" اُس نے آہستہ سے کہا۔ کیا میں پھر انھیں دیکھنے آسکتا ہوں۔

نند تیا نے سر ہلا کر ہاں کر دی۔ دیپک اکثر آتا اور دیکھتا کہ چھوٹی سی گوریا صبر کے ساتھ وہاں بیٹھی رہتی ہے اور چڑا بستر میں ہی اُسے کھانا لا کر دے دیتا ہے۔ نند تیا نے دیپک کو بہلانے کے لئے بالکل نیا لوڈو نکال لیا جو اُس کی خالہ نے اُسے سالگرہ پر دیا تھا۔ کوئی کھیلنے والا ساتھی ہی نہیں تھا اُس لئے نند تیا نے اُسے اب تک نہیں نکالا تھا۔ دیپک روز آتے ہی پوچھتا "کیا انڈوں میں سے بچے نکلے"

"نہیں۔ پر لماں کہتی ہیں کہ کسی بھی دن نکل آئیں گے۔" نند تیا اُس سے کہتی۔ "آؤ ہم لوگ کھیلیں۔"

ایک دن صبح سویرے نند تیا کو گھونسلے میں سے ہلکی ہلکی نازک سی آوازیں سنائی دیں۔ چیں۔ چیں۔

اُس نے ایک کرسی پر چڑھ کر گھونسلے میں جھانکا۔ تین دبلی پتلی گردنیں اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔

تین چھوٹی چھوٹی چونچیں بھوک سے پوری کھلی ہوئی بے چینی سے چیں چیں کر رہی تھیں۔ ان کے لا

اماں کھانا لا رہے تھے اس لئے نند تپا نے جلدی سے اتر کر انھیں راستہ دے دیا اور خوشی سے ہنسنے لگی۔
"دیپک کو ضرور بتا دینا چاہیے۔" وہ چلائی اور دوڑ پڑی اپنے نئے دوست کو ڈھونڈنے۔

ماں کا تحفہ

1942 کے دوران بنگال ایک جٹ ہو کر گاندھی جی کے بھارت چھوڑو آندولن میں حصہ لینے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ آزادی کی اس جنگ میں ایک جوان بنگالی لڑکی' شاردا چٹرجی نے کلکتہ کے پولس کمشنر مسٹر گورڈون جیکسن پر ریوالور تان لیا اور دو فائر کیے۔ یہ حادثہ ایک ہائی اسکول کے تقسیم انعامات کے جلسے میں ہوا جہاں مسٹر جیکسن مہمان خصوصی تھا۔ وہ ایک ظالم افسر مشہور تھا۔ دو مہینے پہلے اُس نے ایک پُر امن جلوس پر فائرنگ کا حکم دیا تھا جس میں دو عورتیں اور کچھ بچے مر گئے تھے۔ اس واقعے کے فوراً بعد تشدد پسندوں کی خُفیہ میٹنگ میں یہ طے کر لیا گیا تھا کہ جیکسن کا نام اس دُنیا سے مٹا دیا جائے۔ یہ کام شاردا کو دیا گیا تھا جو تشدد پسندوں کے گروہ میں نئی نئی شامل ہوئی تھی۔

مگر شاردا اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکی۔ گولیاں جیکسن کے کندھے میں لگیں اور اُسے فوراً اسپتال لے جا کر آپریشن کر دیا گیا۔ وہ بچ گیا۔ تین مہینے بعد اُس کی نوکری ختم ہو گئی اور وہ انگلینڈ واپس چلا گیا۔

شاردا چٹرجی کو پندرہ سال قید ہوئی۔ ان پندرہ سالوں میں سے تین سال اُس نے انڈمان جیل میں گزارے۔ اگر جیکسن مر جاتا تو اور زیادہ سخت سزا ہوتی۔

ارُن نے یہ سب اپنی ماں سے سُنا تھا۔ اُسے بڑا فخر تھا کہ اس کی ماں کوئی عام آدمی نہیں ہے۔

جنگ آزادی کی باتیں اپنی ماں سے سننے کے علاوہ ارُن نے اس موضوع پر بہت سی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ تیرہ سال کی عمر تک وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا اور وہیں شہر کے ایک اسکول میں پڑھتا رہا۔ پھر اُس کے ابا کا انتقال ہو گیا اور شاردا دیوی ایک لڑکیوں کے اسکول میں ٹیچر ہو گئیں۔ اُنھوں نے ارُن کو سلی گڑی پڑھنے بھیج دیا جہاں وہ ہاسٹل میں رہنے لگا۔

جب تک ارُن اپنی ماں کے ساتھ رہا وہ اُسے جنگ آزادی میں اپنے کاموں کی باتیں اور انڈمان جیل میں گزرے حالات سناتی رہتی تھیں۔

ارُن کو بھی جوکھم بھرے کام کرنے کا شوق تھا تین بار وہ اسکول کے سالانہ کھیل کود کے مقابلوں میں بہترین تیراک کی ٹرافی حاصل کر چکا تھا' اور اُس کی تمنا تھی کہ وہ بھارتیہ ہوائی فوج میں پائلٹ بنے۔

اپنی ماں سے دور رہنا ارُن کے لیے بہت تکلیف دہ تھا' مگر اُسے اپنے ہاسٹل کی زندگی بھی اچھی لگتی تھی۔ سلی گڑی کے سینٹ کولمبس کی' دنیا کے پانچ ملکوں میں' ایسی ہی شاخیں تھیں۔ سل گڑی کا اسکول تیستاندی کے کنارے تھا۔ ارُن کو ندی بہت اچھی لگتی تھی۔ امتحان کے زمانے میں جب وہ دیر رات تک پڑھائی کرتا تو باہر اندھیرے میں اُسے ندی بہنے کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دیتی تھی۔ گرمیوں میں تو اس کا بہاؤ ہلکا ہو جاتا تھا مگر برسات میں بہت دہشت ناک ہو جاتا۔ جب بھی ارُن اکیلاپن محسوس کرتا' وہ ندی کے کنارے جا بیٹھتا ندی کافی حد تک اُس کی ماں کی کمی پوری کر دیتی تھی۔

سال میں دو بار ارُن ماں سے ملنے جاتا تھا۔ ایک تو دسہرے میں اور پھر کرسمس پر مگر وہ اُنھیں خط پابندی سے لکھتا تھا۔ ارُن خط اچھے لکھتا تھا اور اپنی ماں کے خط لکڑی کے ایک چھوٹے سے ڈبے میں سنبھال کر رکھتا تھا۔ جب بھی اُسے ماں کی یاد آتی وہ ڈبا اُٹھا کر کھولتا اور کوئی خط نکال کر پڑھنے لگتا۔ اور اُسے لگتا جیسے اُس کی ماں پاس بیٹھی ہوئی ہیں۔

ساری دُنیا میں کوئی نہیں تھا جو ارُن کو اپنی ماں سے زیادہ پیارا لگتا ہو۔ مگر ارُن اُن سے ناراض تھا کیونکہ وہ اُس کی ایک بات نہیں مان رہی تھیں۔

ارُن وہ ریوالور دیکھنا چاہتا تھا جو شاردا دیوی نے جیکسن پر فائر کرنے کے لیے استعمال کیا تھا اور بعد میں جب بھارت آزاد ہو گیا تو اُن کے مداحوں نے اُنھیں تحفے میں دیا تھا۔

ارُن کو بہت ارمان تھا کہ وہ اُسے دیکھے اُسے چھوئے مگر ماں اُسے کبھی اجازت نہیں دیتی تھیں۔

"ابھی وقت نہیں آیا ہے۔" وہ کہا کرتی تھیں۔

"تو پھر کب آپ دکھائیں گی مجھے وہ ریوالور؟"

"جب میں سمجھوں گی کہ صحیح وقت آ گیا ہے تمھیں اُسے دکھانے کا۔" شاردا دیوی صاف صاف ٹکا سا جواب دیتیں۔

اڑن کو معلوم تھا کہ اُس کی ماں کے فیصلے آسانی سے نہیں بدلتے وہ جو طے کر لیتی ہیں وہی کرتی ہیں۔ لیکن اُسے ماں کے اس طرح صاف انکار کر دینے کی وجہ نہیں سمجھ میں آتی تھی' اور نہ ہی 'صحیح وقت' کا مطلب — سمجھ پاتا تھا۔ کچھ بھی ہو' اس طرح منع کر دینے سے اُسے بہت دُکھ ہوا تھا۔

اُس سال کرسمس کی چھٹیوں سے پہلے اڑن کی زندگی میں ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ لندن کے سینٹ کولمبس سے دس لڑکے سلی گڑی میں اپنے اسکول کی دوسری شاخ کو دیکھنے آئے' تاکہ دنیا کے دوسرے کونے میں اپنے جیسے طالب علموں کی زندگی کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔ اُس گروپ کے انچارج ایک بوڑھے ٹیچر فادر رونالڈ تھے۔

اڑن اور اُس کے دوستوں کو اُن لڑکوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ایک دوسرے سے مل کر اُنہیں لگا کہ اُن میں بہت سی باتیں ملتی جلتی ہیں۔

لندن والے لڑکوں کی واپسی سے ایک دن پہلے ندی کے کنارے ایک پکنک کا انتظام کیا گیا۔ وہ اتوار کی ایک کھلی ہوئی صبح تھی۔ ندی کے کنارے پر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اڑن کے تاریخ کے ٹیچر سُبیر رائے اور فادر رونالڈ پکنک پر لڑکوں کے ساتھ گئے تھے۔

ندی کے کنارے بیڈ منٹن کھیلتے کھیلتے کچھ لڑکوں کو اچانک خیال آیا کہ ندی میں نہایا جائے۔ وہ سُبیر بابو کے پاس اجازت لینے گئے جو کھانا پکنے کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔

"سر ہم ندی میں نہانا چاہتے ہیں" لڑکوں نے کہا "بہت مزا آئے گا اگر آپ اجازت دے دیں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر صرف وہی لڑکے جائیں جو تیرنا جانتے ہوں اور وہ بھی کنارے سے زیادہ دور نہ جائیں۔"

فادر رونالڈ نے بھی اجازت دے دی۔

پتا چلا سب لڑکوں میں سے آٹھ لڑکے تیرنا نہیں جانتے تھے۔ وہ بیڈ منٹن کھیلتے رہے اور اٹھارہ لڑکے نہانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اُن میں سے ایک ڈک تھا جو اڑن سے ایک سال چھوٹا تھا مگر بہت تیز طرار لڑکا تھا۔ اڑن کو ڈک سب سے اچھا لگتا تھا۔ اُس کی آنکھیں نیلی نیلی تھیں اور وہ ماؤتھ آرگن بہت اچھا بجاتا تھا۔ روز رات کو کھانے کے بعد جب لڑکے ہال میں جمع ہوتے تو وہ ماؤتھ آرگن پر

دُھنیں بجابجا کر سب کو مست کر دیتا۔

"ماں آپ کو پتا ہے تیستا ندی کیسی ہے؟" بعد میں پکنک کے بارے میں ارُن نے اپنی ماں کو خط میں لکھا۔ "کبھی کبھی وہ بہت خاموش اور شانت لگتی ہے مگر کوئی نہیں جانتا کہ کب ذرا سی دیر میں وہ شور مچانے لگے اور اُس کی موجیں جوش میں آجائیں۔ اور اُس دن تو ہم لوگ بھی یہ اندازہ نہیں لگا پائے کہ آج ندی نے کیا ٹھان رکھا ہے۔ پہلے دس لڑکے دریا میں کودے۔ اُن میں ڈِک بھی شامل تھا۔ اُس وقت تک میں کنارے پر ہلکی پھلکی ورزش کر رہا تھا۔ اچانک مجھے 'بچاؤ' 'بچاؤ' کی چیخیں سنائی دیں۔ میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو ڈِک تیز لہروں میں پھنسا مدد کے لیے چیخ رہا تھا۔ دوسرے لڑکے اُس تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے مگر اُنہیں کامیابی نہیں مل پا رہی تھی۔

"یہ دیکھ کر مجھ پر بجلی سی گر گئی۔" ارُن نے لکھا۔ "ڈِک جس طرح ہاتھ پیر مار رہا تھا اُس سے مجھے پورا اندازہ ہو گیا کہ وہ تیرنا نہیں جانتا۔ ذرا سی دیر میں وہ اُس جگہ پہنچ جائے گا جہاں لہریں سب سے تیز ہیں اور پھر جو بھی اُسے بچانے جائے گا نہ وہ بچ پائے گا اور نہ ڈِک' اور میں نے چھلانگ لگا دی۔ مجھے معلوم تھا کہ خطرہ بہت ہے۔ لیکن میں کھڑے کھڑے ایک دوست کو ڈوبتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ ہم سب کے لیے شرم کی بات تھی۔ میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ کس دن کوئی بڑا جوکھم بھرا کام کروں۔ مجھے لگا اس سے بہتر موقعہ مجھے پھر نہیں مل سکتا۔

"میں جتنا تیز تیر سکتا تھا میں نے تیرنے کی کوشش کی۔ بہاؤ مخالف تھا مگر میں کوشش کرتا رہا۔ مجھے تیراکی کی جتنی ترکیبیں آتی تھیں میں نے سب آزمالیں۔ تیز لہروں سے لڑنے کے ساتھ ساتھ میں سر اُٹھا کر کنارے کی طرف دیکھا بھی جاتا تھا۔ جہاں فادر رونالڈ اور سُبیر بابو تیز تیرنے کے لیے میری ہمت بڑھا رہے تھے اور ساتھ ہی ڈِک سے کہہ رہے تھے کہ وہ کسی طرح تیرتا رہے۔ بیچارہ لڑکا تب تک بالکل ہمت ہار چکا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم کب اور کیسے میں ڈِک کے ٹھنڈے جسم تک پہنچا۔ مجھے دھندلا دھندلا سا یاد ہے کہ میں ایک بے ہوش جسم کو پکڑ کر کھینچ رہا تھا اور ساتھ ہی پوری طاقت سے تیر بھی رہا تھا۔

"جب میں نے آنکھیں کھولیں تو سورج ڈوب رہا تھا۔ میں اپنے اسکول کے اسپتال میں بستر

پر لیٹا تھا۔ میں نے دیکھا ہمارے پرنسپل مسٹر مارٹن' فادر رونالڈ اور سسٹر بابو میرے بستر کے پاس پریشان کھڑے تھے۔

"ڈک کیسا ہے؟' میں نے پوچھا۔

"وہ ٹھیک ہے" مسٹر مارٹن نے جواب دیا اور بہت پیار سے پوچھا 'اب تمہیں کیسا لگ رہا ہے ارُن'

"میں بالکل ٹھیک ہوں سر" میں نے بجھی بجھی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"مسٹر مارٹن نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا 'ارُن تم نے ایک بہادر ہیرو والا کام کیا ہے تم

تقریباً تین میل تک ندی میں تیرے جب کہ لہریں بھی بہت تیز تھیں۔ '

'بہادر لڑکا ہے' فادر رونالڈ نے میری طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔ 'شکریہ سر' میں نے کہا۔

" مجھے ڈک نظر آیا میں نے اپنے پلنگ پر بیٹھ کر دیکھا تو وہ مجھے کمرے کے ایک کونے میں پلنگ پر لیٹا دکھائی دیا۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا۔ 'شیطان لڑکا' میرا دل چاہا اُسے زور سے ڈانٹ پلاؤں۔ 'تم جانتے تھے کہ تمہیں تیرنا نہیں آتا ہے۔ تم ندی سے کھیلنا چاہتے تھے۔ '

"جب میں وہ چوکلیٹ دودھ پی چکا جو مسٹر مارٹن کا بیرا میرے لئے لایا تھا تو فادر رونالڈ نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بھاری آواز میں کہا 'اڑن کل میں واپس انگلینڈ جا رہا ہوں۔ تمہیں پتہ ہے جتنے دن میں نے یہاں بتائے ہیں ان میں سب سے قیمتی یاد کون سی ہے؟ تمہاری بہادری!! اگر تم اپنی جان خطرے میں ڈال کر ڈک کو نہ بچا لیتے تو اپنے وطن واپس جا کر مجھے بہت شرمندگی ہوتی۔ میں ڈک کے ماں باپ کو کیا جواب دیتا؟ گاڈ بلیس یو' میرے بیٹے۔' یہ کہتے ہوئے اُن کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

" شیر بابو نے بتایا' 'شاید تمہیں پتہ نہیں ہو گا اڑن۔ کہ ڈک کا نام یہاں آنے والے لڑکوں کی اصلی لسٹ میں شامل نہیں تھا۔ اُس کی عمر کم تھی۔ مگر اُس نے ضد کی ۔ضرور جائے گا کیونکہ ہمارے ملک سے اُس کا ایک خاص رشتہ تھا۔

"خاص رشتہ! میں نے پوچھا۔

"ہاں شیر بابو نے مسکرا کر جواب دیا 'اُس کے ابّا نے یہاں کئی سال تک کام کیا تھا۔'

"فادر رونالڈ نے مجھے ڈک کے بارے میں جو کچھ بتایا اُسے سُن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ میں جب آپ سے ملوں گا تو اُس کے بارے میں بتاؤں گا۔ آپ کو بھی اتنی ہی حیرت ہو گی جتنی مجھے ہوئی تھی۔

"مسٹر مارٹن کا کہنا کہ مجھے گھر پر ہی کچھ دن رہ کر ٹھیک سے آرام مل پائے گا۔ اُنہوں نے تو میرا کلکتے کا ٹکٹ بھی بُک کر دیا ہے۔ میں اتوار کی صبح دارجلنگ میل سے سیالدہ پہنچ رہا ہوں۔ امید ہے آپ مجھے اسٹیشن پر ملیں گی۔ گڈ بائی۔

بہت سا پیار

اڑن"

شاردا دیوی وقت سے پہلے ہی اسٹیشن پر پہنچ گئیں۔ وہ اڑن کو دیکھنے کے لیے بے چین تھیں۔ اُنہیں مسٹر مارٹن کا بھی ایک چھوٹا سا خط ملا تھا جس میں اُنہوں نے لکھا تھا کہ سارے اسکول کو اڑن پر فخر ہے۔ اُنہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ اڑن کے سینے میں ابھی ہلکا ہلکا درد ہے۔ اس لیے ڈاکٹر نے اُسے ایک ہفتے آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اسی لیے اُنہوں نے اڑن سے کچھ دن اپنی ماں کے پاس چلے جانے کے لیے کہا ہے۔

جیسے ہی اڑن ٹرین سے اترا شاردا دیوی اُس سے لپٹ گئیں۔

"ماں آپ کیسی ہیں؟" اڑن نے مسکرا کر پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں پر تم کمزور لگ رہے ہو اڑن!"

"نہیں میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں" اڑن نے بہت بھروسے کے ساتھ کہا۔

وہ لوگ ٹیکسی میں بیٹھ گئے تو شاردا دیوی نے اپنے بیٹے سے پوچھا "اڑن تم نے خط میں لکھا تھا کہ تم ڈِک کے بارے میں مجھے کچھ بتاؤ گے۔ بتاؤ کیا بات ہے؟"

"ہاں ماں وہ اتنی مزے کی بات ہے کہ میں نے سوچا کہ آپ کو مل کر ہی بتاؤں" اڑن نے اپنی ماں کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ کو معلوم ہے ماں ڈِک کون ہے؟ مسٹر گورڈون جیکسن کا سب سے چھوٹا بیٹا' جو ۱۹۴۲ء میں کلکتہ کے پولیس کمشنر تھے......"

شاردا دیوی کا سر چکرا گیا۔ اُن کا ذہن سیاسی ہلچل کے اُن پرانے دنوں کی یادوں میں بھٹک گیا۔ وہ دن یاد آ گئے۔ کانوں میں 'بندے ماترم' کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اچانک پولس نے گولیاں چلا دیں۔ جھنڈا اُٹھائے ستر سال کی بوڑھی عورت کے گولی لگی۔ اُس کے مرنے سے پہلے ہی اُس کا نوجوان لڑکا دوڑ کر آیا اور جھنڈا اُٹھالیا......'

اڑن کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اچانک اُس کی ماں اتنی اُداس کیوں ہو گئیں۔ "ماں" اُس نے پکارا مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ شاردا دیوی اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی باہر سڑک کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

اڑن کو بہت بُرا لگا کہ اُس کی ماں نے ڈِک کو ڈوبنے سے بچانے کے لیے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اُس نے سوچا اُنہیں ضرور تکلیف ہوئی ہے کہ میں نے مسٹر جیکسن کے بیٹے کو بچالیا' جنہوں نے

ہمارے وطن کے لوگوں کو اتنا پریشان کیا تھا۔

ٹیکی اُن کے گھر کے سامنے جا کر رُک گئی۔ شاردادیوی جلدی سے ٹیکسی سے اُتریں کرایہ دیا۔ رامو کاکا کو آواز دی۔ "رامو کاکا ارُن کا سوٹ کیس اُٹھا لیجیے؟" "میرے ساتھ آؤ ارُن" شاردادیوی نے کہا وہ اب بھی بہت اُداس لگ رہی تھیں۔

ارُن اپنی ماں کے پیچھے پیچھے اُن کے کمرے میں گیا۔ کمرے میں اُنہوں نے الماری کھول کر دراز سے ایک ڈبا نکالا۔

"ارُن!" شاردادیوی نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُن کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو ارُن نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ "میں نے یہ قیمتی چیز اتنے دن اپنے پاس رکھی۔ میرے اوپر اس کی بہت ذمہ داری تھی' کیونکہ یہ ہماری سرزمین کے بہت سے جاں باز لوگوں کی قربانیوں اور جاں بازیوں کی نشانی ہے۔ میں چاہتی تھی کہ اِسے میں تمہیں اس وقت دکھاؤں جب تم اُس کے لائق بن جاؤ کیونکہ اتنی قیمتی چیز کو ایسے ہاتھوں میں نہیں دیا جاسکتا جو اُس کی قدر نہ کر سکیں۔" شاردادیوی ذرا سی دیر چپ رہیں پھر جذبات سے بھری بھاری سی آواز میں بولیں۔ "میں یہ کہتے ہوئے بہت خوش ہوں کہ تم نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ تم نہ صرف اُس کو دیکھنے بلکہ اُسے اپنے پاس رکھنے کے لائق بھی ہو۔ میرے بیٹے' تمہارے دوستی کے جذبے اور تمہاری بہادری کا انعام دینے کے لیے میرے پاس آج اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہے"

اُنہوں نے وہ ڈبا ارُن کو دے دیا۔ ارُن نے جھک کر اُن کے پیر چھوئے اور پھر اُن کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے مگر ہونٹوں پر مُسکان تھی۔

ارُن کی نظروں میں ایک اور مسکراتا ہوا چہرہ گھوم گیا۔ ڈِک جیکسن کا چہرہ۔
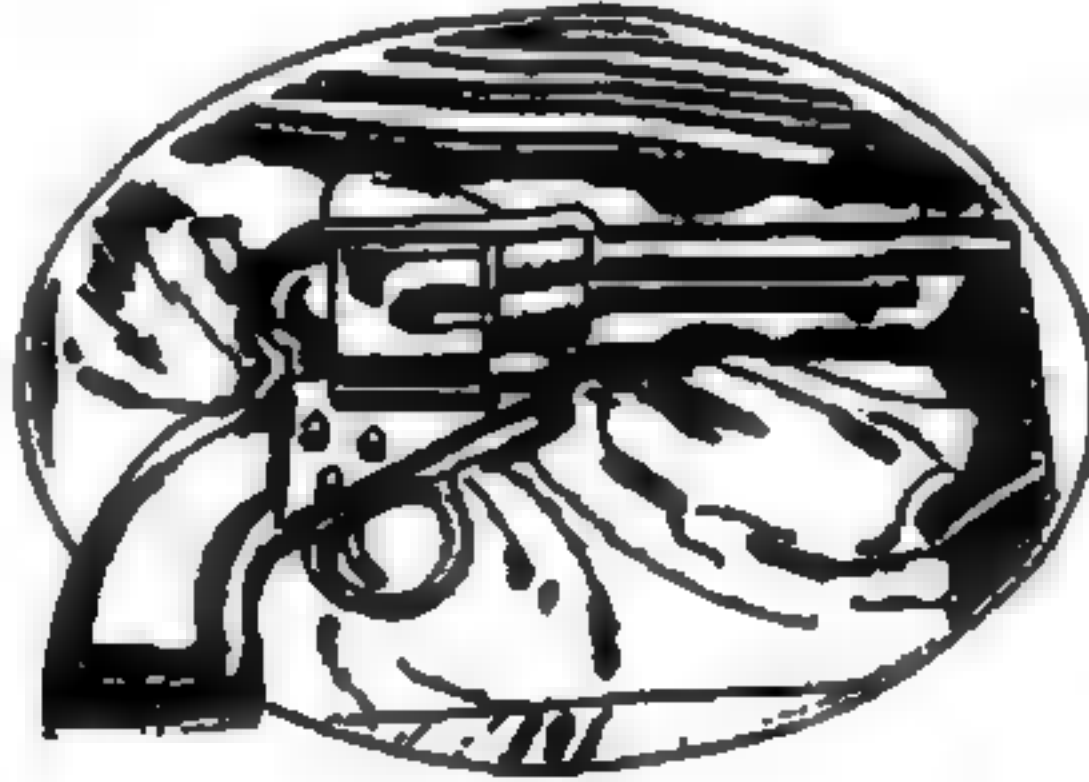
دریا کا گیت

اونچی پہاڑی وادی میں گرمیوں کا موسم تھا۔ گھونگھرو نے ایک لمبی سی سانس لی۔ اور پھر جب اُس نے اپنے گھونگریالے بالوں کو جھٹک کر پیچھے کیا تو اُس کی پائلوں کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ لہراتی بل کھاتی احتیاط سے اپنا راستہ بناتی اونچے پہاڑ کی پگھلتی برف سے باہر آگئی۔

اس میں واقعی کوئی حیرت کی بات نہیں کہ یہ چھوٹی سی پہاڑی ندی گھونگھرو کہلاتی تھی کیونکہ یہ ہمیشہ ناچتی گنگناتی رہتی تھی۔ خوش و خرم اتنی بڑی دنیا میں اپنا راستہ تلاش کرنے کے لئے بے چین اور بیتاب۔ اونچے پہاڑ کے چکنے پتھروں پر کودتی اچھلتی دل ہی دل میں گنگناتی۔

'بالوں میں میرے سورج سجا ہے
ہونٹوں پہ ہے ایک گیت
رستے میں آئیں جتنی چٹانیں
چلتے رہنا میری ہے ریت'

اونچے چناروں کے پاس سے جب وہ تیزی سے گزرتی تو ایسی سرسراہٹ ہوتی جیسے پیڑ اُسے جھک کر الوداع کہہ رہے ہوں۔

ٹھنڈی ہوا اُس کے کانوں میں سیٹی بجاتی اور کہتی "سنبھل کر سامنے بڑی سی چٹان ہے۔"

خوشی سے کل کل کرتی ننھی گھونگھرو چھینٹے اڑاتی بڑی سی چکنی چٹان پر چڑھ جاتی اور جھرنے کی طرح بہنے لگتی۔

وہ اپنے قدم تیز کر دیتی اور پتھریلے پہاڑی ڈھلان میں اپنے لئے ایک الگ پتلا سا راستہ کاٹ لیتی۔

"رکو گھونگھرو رک جاؤ ہم بھی تمھارے ساتھ آرہے ہیں اُس کے راستے میں آنے والے چھوٹے بڑے پتھر چلاتے۔

"آنا ہے تو بس ساتھ آجاؤ میں رک نہیں سکتی ہمیں ابھی بہت۔ بہت سارا راستہ طے کرنا

کیونکہ وہ جوان اور طاقت ور تھی۔ ہے۔وہ خوشی سے گنگنا کر کہتی اور انھیں تیزی سے اُٹھا کر چلنے لگتی۔

وہ سب ساتھ ساتھ اُچھلتے کودتے اونچے پہاڑ کے دامن میں سورج کی روشنی میں نہائی لمبی

چوڑی وادی میں پہنچ جاتے۔

یہ پہلا موقعہ تھا جب گھونگرو اونچی وادی میں الگ تھلگ اپنے گھر سے دور نکلی تھی۔ اور اُس

نے اپنے ہمیشہ کے ساتھی خاموش صنوبر اور چنار کے پیڑوں کو چھوڑا تھا۔

جب برف سے ڈھکی پیاری سفید چوٹیاں اس کی نظروں سے اوجھل ہوئیں تو ایک لمحے

کے لئے اُسے دل میں کچھ درد سا محسوس ہوا۔ مگر ساری یادوں کو جھٹک کر پیچھے دیکھے بنا وہ طوفانی رفتار سے ہرے بھرے گھاس کے میدانوں میں بڑھتی چلی گئی۔ جہاں جنگلی پھول اشارے کر کے اُسے اپنی طرف بلا رہے تھے' کنکر اور پتھر جو وہ اپنے ساتھ لائی تھی خوشی سے پاگل ہو کر چلائے۔ اور اُس کے گانے میں شامل ہو گئے۔

'ہری بھری وادیوں میں اچھلتے کودتے

ہم آگے ہی آگے بڑھتے جاتے ہیں

اپنا میٹھا گیت سناتے ہیں'

اور خوشی سے ہلکورے لیتی گھونگرو ڈھلانوں پر آہستہ آہستہ بہتی آگے بڑھ گئی' کبھی دھوپ میں ہرے بھرے شاداب سیب کے پیڑوں کو ایک نظر دیکھنے کے لئے وہ اپنے آپ کو پھیلا لیتی' کبھی دور اونچے آسمان پر اڑتے سنہری عقاب کو دیکھ کر اُچھل کر ہاتھ ہلاتی۔

پہاڑ سے نیچے تک آنے کے اس تیز رفتار سفر سے گھونگرو تھک گئی۔ اُس کی سانس پھول گئی۔ اُس نے قدم کچھ آہستہ کر دیئے کچھ دیر رک کر دور دور تک پھیلے میدانوں میں کابلی کے ساتھ چرتی گائے بھینسوں کو دیکھنے لگی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں دکھنے لگے تھے اب کنکر پتھروں کو اٹھا کر چلنا بھی اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔

"معاف کرنا' مجھے افسوس ہے اب مجھے تمھیں پیچھے چھوڑنا پڑے گا۔" اُس نے کچھ بڑے پتھروں سے کہا کیونکہ میں اب جوان اور طاقت ور نہیں رہی ہوں۔ اُس کی پتلی دبلی نازک سی کاٹھی بھی اب ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ اچھی خاصی چوڑی اور پھیلی ہوئی سی ہوتی جا رہی تھی۔ اب تو اُس کی رفتار بھی کافی سست ہوتی جا رہی تھی۔

بڑے پتھروں نے پیچھے چھوٹ جانے کا برا نہیں مانا۔ اتنی تیزی سے نیچے اترنے میں اونچی نیچی وادیوں سے سیدھی سطح تک پہنچنے میں وہ اتنے اُچھلے کودے تھے اور اتنی چوٹیں کھائی تھیں کہ وہ تھک گئے تھے۔ اُس کے علاوہ پڑے پڑے دھوپ سینکنے کے لئے گرما گرم سورج موجود تھا۔ دیکھنے کو ننھے منّے پیارے بچے تھے جو گیلے گیلے کنارے پر اچھلتے کودتے شور مچاتے کھیلتے رہتے۔

مگر چھوٹے کنکر اور ریت کے ذرے جو اُس کے ساتھ پہاڑوں سے یہاں تک آئے تھے' وہ درخواست کرنے لگے "اے گھونگرو ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ ہمیں چھوڑ کر مت جاؤ۔ ہم بھی نیلا سمندر دیکھنا چاہتے ہیں۔" کیونکہ لمبے سفر کے دوران گھونگرو اکثر ان کا دل بہلانے کے لئے انھیں خوبصورت سمندر کی وہ کہانیاں سناتی آئی تھی جو اُس نے کسی سے سُنی تھیں' وہ نیلا سمندر جو اتنا بڑا ہے۔ اتنا بڑا کہ اُس کا تصور بھی ■ نہیں کر سکتے۔ تو پھر وہ کنکر پتھر اور ریت ساتھ ہی رہے اور ہموار میدانوں میں بل کھاتا راستہ بنا کر آگے بڑھنے لگے۔

گھونگرو اب ایک بوڑھی عورت تھی اُس کی گھنٹیوں کی تیز جھنکار بھی اب کچھ دھیمی پڑ گئی تھی۔ اُس کے گھونگریالے بال اب سیدھے ہو گئے تھے۔ اور ان میں کہیں کہیں چاندی سی جھلکنے لگی تھی وہ اب خوب چوڑی اور بھاری بھی ہو گئی تھی۔

وہ شہر شہر گھاٹ گھاٹ پھرتی رہی تھی جہاں اُس کا صاف ستھرا شفاف پانی بھی گندا اور مٹ میلا ہو گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں اور ڈونگیاں اُس کے ہلکے ہلکے بہتے پانی میں چکر لگاتے تھے۔ اُس کے چوڑے چوڑے کناروں پر مچھیرے بیٹھے رہتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ننگ دھڑنگ لڑکا اُس کی خاموش گہرائیوں میں بے دھڑک چھلانگ لگا دیتا۔

لگتا تھا اب آگے بڑھنا اور مشکل ہو گیا ہے۔ ہر قدم پر وہ ایک تیز درد سے کراہتی تھی۔ ننھے

ننھے کنکر جو وہ ساتھ لائی تھی بہت پہلے ہی گھس گھسا کر چھوٹے چھوٹے ریزے بن چکے تھے' مگر اب تو اُس کے کمزور ہاتھوں کے لئے وہ بھی بہت بھاری تھے۔ آہستہ آہستہ وہ سب زمین میں تہہ پر جمنے لگے۔ گھونگرو کراہ اٹھی' کیونکہ کنکروں کے اُس ٹیلے کو ہلانے کی اب اُس میں طاقت نہیں تھی۔ مجبوراً اُس کا پانی چھوٹی چھوٹی شاخوں میں بٹ گیا۔

دور نیلا سمندر چمک رہا تھا۔ اُس کے اپنے تصور سے بھی زیادہ بڑا چوڑا' اشارے کر کے اُسے اپنے پاس بلاتا' خوش آمدید کہتا سمندر۔ اُس کی ہمت بڑھ گئی۔ وہ مسکرائی اور ایسی سرگوشی میں جو سنائی بھی نہ دے گانے لگی۔

' آ گیا میرا گھر۔ یہ سمندر ہی تو میرا گھر ہے۔ میرے پیروں کی پائل اپنی آخری گیت گا لے۔'

اور پھر اُس کا پانی سمندر کے پانی سے مل گیا اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اپنی منزل پر پہنچ چکی تھی۔

انسانی روبوٹ

"سپر روبوٹ پلازا" کے چمکتے جھل مل کرتے نیون سائن کو دیکھ کر پریم چوپڑا کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ آگئی۔ اُس نے ٹریفک سے بھری سڑک پار کرکے اُس اسٹور کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا 'اب میں اپنا ایک 'نوکر' خرید سکتا ہوں۔ لوٹی ہوئی رقم کو اس سے زیادہ فائدے کے کام میں نہیں لگایا جاسکتا۔ سپر روبوٹ اپنے الیکٹرونک فنکشن اور قاعدے سے کام کرنے کے معاملے میں بہت مشہور ہیں اور واقعی وہ ہیں بھی اچھے۔

"میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں جناب" سپر روبوٹ پلازہ میں گنجے سے چندھی آنکھوں والے ایک آدمی نے دانت نکال مصنوعی ہنسی کے ساتھ کہا۔

"وہ........." پریم چوپڑا گھبرا گیا۔ اُس نے ٹوئیڈ کے کوٹ کی جیب سے رومال نکال کر ماتھے پر آئے پسینے کے قطروں کو پونچھا' ٹائی کی گرہ درست کی اور ایک بار پھر اپنے اندر کچھ اعتماد پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "میں ایک روبوٹ خریدنا چاہتا ہوں......"

"اپنی مدد کے لئے جناب!؟" سیلز مین نے اُس کا جملہ پورا کردیا۔ "یہی تو ہماری خصوصیت ہے۔ ہم بہت کارآمد روبوٹ تیار کرتے ہیں۔ فیکٹریوں کے لئے۔ مکان بنانے والی کمپنیوں کے لئے' صفائی کا کام 'نلوں کی مرمت یا کسی بھی کام کی دیکھ بھال کرنے والے۔ کسی بھی خاص کام کے لئے یہ روبوٹ ڈیزائن کئے جاتے ہیں۔ ہمارے سب سے اچھے روبوٹ 'آپ جیسے گاہکوں کے لئے ہی ہیں 'گھر کا کام کرنے والے روبوٹ۔" وہ ایسے بول رہا تھا جیسے رکارڈ کیا ہوا کوئی پروگرام سنایا جارہا ہو۔

"جی ہاں مجھے ایسا ہی چاہیے۔" پریم چوپڑا نے کاروباری انداز میں کہا۔

"ادھر آیئے جناب" سیلز مین تیز روشنی والی گیلری کی طرف بڑھا جس میں بہت قیمتی قالین بچھا تھا۔ گیلری سے گزر کر وہ ایک گنبد نما ہال میں پہنچے جو فلوریسینٹ لائٹوں سے جگمگا رہا تھا۔ سیدھے ہاتھ کے کونے میں لگتا تھا جیسے ہرے نیلے اور چاندی کے رنگ کے روبوٹ کی بھیڑ جمع ہو۔

کچھ ایسے چل رہے تھے جیسے ابھی چلنے کی مشق کر رہے ہوں لیکن کچھ بالکل ساکت کھڑے تھے۔ جیسے اُن کا سوئچ بند کر دیا گیا ہو۔ جیسے ہی پریم چوپڑا نے ہال کے دروازے میں قدم رکھا ایک روبوٹ تیزی سے آگے آیا "گڈ ڈے سر اسپر روبوٹ پلازا میں آپ کا سواگت ہے۔ امید ہے آپ کا یہاں تشریف لانا کار آمد ثابت ہو گا۔" چاندی کے رنگ کا روبوٹ مشینی آواز میں بولا۔

"کمال ہے" پریم چوپڑا ہکا بکا ہو کر منہ ہی میں بُد بُد لیا۔

سیلز مین فخر سے مسکراتا ہوا ایک نیلے رنگ کے روبوٹ کی طرف بڑھا۔ جو الگ تھلک کھڑا تھا۔ "یہ روبوٹ گھر کا کام کرنے کے لیے بہت کمال کے ساتھ پروگرام کیا گیا ہے۔ صفائی ستھرائی' بازار سے سودا لانا' لان کی گھاس کاٹنا خط ڈاک میں ڈالنا' T.V. پر آپ کے پسند کے پروگرام لگانا' اخبار میں سے آپ کے پسند کی خبریں چننا" سیلز مین سانس لینے کے لیے ذرا سا رُکا اور پھر شروع ہو گیا "آپ جو کچھ چاہیں بس صرف ایک ریموٹ کنٹرول کی مدد سے اسے ہدایت دے سکتے ہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے گھر پر بیٹھ کر میں اُسے شہر کے بازار میں ہدایت دے سکتا ہوں۔" پریم چوپڑا نے پوچھا۔

"یہ والا روبوٹ آدھے کلو میٹر ریڈیس (قطر) کی حد میں کام کر سکتا ہے ویسے اُس کا نام رام سنگھ 070 ہے" سیلز مین نے سمجھایا۔

پریم چوپڑا نے سر ہلایا۔ سیلز مین نے روبوٹ کی رفتار' پکڑ اور مختلف حرکتوں اور کچھ دوسرے کاموں فنکشنز کو جو اُس میں پروگرام کیے گئے تھے ایک بار پھر آزمایا۔ ہر چیز بالکل ٹھیک ٹھاک اور اپنی جگہ تھی۔

"میں اسے لوں گا" پریم چوپڑا نے فیصلہ کر لیا۔

"ضرور جناب" سیلز مین نے سر جھکا کر کہا "آپ میرے ساتھ دفتر میں تشریف لے چلیں تو میں آپ کو اُس کے ...... میرا مطلب ہے رام سنگھ کے کام کرنے کے طریقے سمجھا دوں اور اُس کو استعمال کرنے کا ہدایت نامہ وغیرہ بھی آپ کو دوں۔"

"ضرور ضرور" پریم چوپڑا اُس سودے سے مطمئن لگ رہا تھا۔

"ہاں ایک اور ضروری بات میں آپ کو بتادوں......وہ یہ کہ دوسرے تمام روبوٹ کی طرح' اور روبوٹ سازی کے قائدے کے مطابق رام سنگھ کے اندر ایک خاص سسٹم (طریقہ) ہے۔اس سسٹم کے تین اُصول ہیں۔روبوٹ اپنے مالک کا حکم مانے گا۔روبوٹ انسانوں کو نقصان نہیں پہنچائے گا اور روبوٹ اپنے اوپر بھی کوئی خطرہ مول نہیں لے گا۔"

پریم چوپڑا نے پہلا اُصول سن لیا وہ اس سے بہت متاثر بھی ہوا۔ مگر اُس نے باقی دو اُصولوں پر دھیان نہیں دیا۔ اُس نے خوشی خوشی سر ہلایا اور سودے کے کاغذ اور "روبوٹ کے غلط استعمال نہ کرنے" کے معاہدے پر دستخط کر دیے۔اُسے ایک نوکر ایک 'نُرگا' مل گیا تھا۔

'اگر رام سنگھ۔ 070 میرا روبوٹ دوکان سے کھانے پینے کا سامان خرید سکتا ہے تو پھر اور بڑھیا چیزیں جیسے ہیرے جواہرات 'کیوں نہیں لا سکتا' پریم چوپڑا نے سوچا۔

بازار میں اب روبوٹ بڑے بڑے پیکٹ اُٹھائے' سینما کے ٹکٹ خریدتے' کھانے پینے کا سامان اُٹھا کر کاروں میں رکھتے' عام طور پر نظر آتے تھے' مگر اب بھی لوگ ان حیرت انگیز نوکروں کو دلچسپی سے دیکھتے تھے۔رام سنگھ 070 نہایت فرمابردار تھا۔ بہت تیزی اور صفائی سے کھانے پینے کی چیزیں اُٹھا کر سودا رکھنے کی ٹرالی میں رکھتا اور پھر رُک کر اگلے حکم کا انتظار کرنے لگتا۔ "دو کلو آم پکے اور رس بھرے" پریم چوپڑا نے آموں کے بڑے سے ڈھیر کو دیکھ کر دور سے حکم دیا اور فوراً ہی رام سنگھ 070 نے بہترین آم چُن لیے۔

"کیش کاؤنٹر پر پیسے دے دو" پریم چوپڑا نے ریموٹ کنٹرول کے اسپیکر میں کہا۔رام سنگھ۔ 070 رُکا' مُڑا اور بیچ کے راستے پر لوگوں کے درمیان بچتا بچاتا ایک تہذیب یافتہ شہری کی طرح جا کر لائن میں پیچھے کھڑا ہو کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ پریم چوپڑا بازار کی چمک دمک کے مزے لینے لگا۔وہ روبوٹ کی چستی پھرتی اور ہوشیاری سے بہت خوش تھا۔

رام سنگھ 070 وفادار کتے کے طرح پریم چوپڑا کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ پریم چوپڑا گوپال جیولرز کے سامنے جا کر رُکا۔ شیشے کی کھڑکی کے پیچھے سے اُس نے بہت سے سونے کے زیوروں کو دیکھا جو گاہکوں کو دکھانے کے لیے شوکیس میں لگائے گئے تھے۔ جھٹ پٹ پریم چوپڑا ایک کونے میں

چُھپ گیااور ریموٹ کنٹرول میں جلدی جلدی مگر صاف صاف بولا۔ ”ایک ہار اُٹھا کر چُھپالو۔ کوئی آواز نہیں کرنا۔ اور یہ بات کسی کو بتانا نہیں۔ بہت راز کی بات ہے۔ ورنہ میں تمہارے سسٹم کا فیوز اُڑا دوں گا۔“ اُس نے دھمکی دی۔

رام سنگھ 070 دوکان میں داخل ہو گیا۔ کاونٹر کے قریب گیا۔ اُس کی آہنی ہتھیلی آگے

بڑھی اور ہار کسی قسم کے کھٹکے یا آہٹ بغیر اُس کے چیزیں رکھنے والے حصے میں چلا گیا۔ کسی نے نہیں دیکھا۔ جوہری ایک گاہک سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ پریم چوپڑا نے سارا ماجرا اپنی دور بین سے دیکھا۔ اُس نے اپنی پہلی کامیابی کی خوشی کا جشن منانے کے لیے سگریٹ میں ایک لمبا کش لگایا۔ رام سنگھ -070 باہر چلا گیا۔

شروع شروع میں قیمتی نوادرات' زیورات اور قیمتی پتھروں کی دوکانوں پر یہ چوری بغیر کسی پریشانی کے چلتی رہی۔ کسی کو چور کا کوئی سُراغ نہیں ملا مگر رفتہ رفتہ دوکان داروں کی گھبراہٹ اور پریشانی کافی بڑھ گئی۔ ان سب باتوں سے بے خبر پریم چوپڑا نے دوکانیں لوٹنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ پر ایک دن ایک نوجوان پھل والے نے افغانی انگوروں کے ایک بہت قیمتی گچھے کو فولادی نیلے روبوٹ کے اندر غائب ہوتے دیکھ لیا۔ اِس واقعے کی خبر تیزی سے چاروں طرف پھیل گئی لوگوں نے جیسے ہی یہ خبر سُنی' تو کچھ دوکان داروں کو یاد آیا کہ جب اُن کے یہاں سے قیمتی چیزیں غائب ہوئی تھیں تو اُن کی دوکان میں ایک نیلا روبوٹ موجود تھا۔ فوراً ہی یہ اطلاع پولس ہیڈ کوارٹر میں پہنچ گئی۔

ایک دن پریم چوپڑا رام سنگھ -070 کو قیمتی ہیرے چرانے کے لیے "جھاولی برادرس" کی طرف لے کر گیا پولس چوکس تھی' کمپیوٹر کی مدد سے کام کرنے والے کیمروں نے 'جو پل پل کی رکارڈنگ کر سکتے تھے' رنگے ہاتھوں اُس کی تصویریں اُتار لیں۔ رام سنگھ روبوٹ پکڑا گیا مگر اپنی دور بین کی مدد سے جیسے ہی پریم چوپڑا نے یہ دیکھا' وہ فوراً بھاگ گیا۔ دو لوگوں نے رام سنگھ کے فولادی گلے پر لکھا لائسنس نمبر نوٹ کر لیا۔

پریم چوپڑا کو اُس کے گھر سے گرفتار کر لیا گیا۔ کیونکہ وہ رام سنگھ -070 چور کا مالک تھا۔

اپنی گرفتاری کے فوراً بعد پریم چوپڑا کو عدالت میں مقدمہ شروع ہونے تک ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ چوری کا کوئی سامان اُس کے پاس سے برآمد نہیں ہوا۔

اُس نے اپنے گروہ کے ذریعے سامان کو چالاکی کے ساتھ ٹھکانے لگا دیا تھا۔ عدالت میں اُس نے سارے الزامات قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

"لگتا ہے کسی نے رام سنگھ -070 کے پروگراموں میں کچھ چھیڑ چھاڑ کی ہے۔ پولس کو میں

اپنے گھر میں بلا تھا۔" اُس نے بحث کی۔

"پہلی بات تو یہ کہ تم نے روبوٹ کیوں خریدا تھا؟" سرکاری وکیل گویل نے پوچھا۔

"گھر کے کاموں میں مدد کے لیے"

"یقیناً اُس کو چلنے پھرنے کام کرنے کی ہدایتیں تم ہی دے سکتے تھے۔"

"بالکل۔ مگر میں اُس کے پروگراموں میں تبدیلی نہیں کر سکتا تھا۔ شاید سُپر روبوٹ پلازا میں کوئی رام سنگھ -070 کو کنٹرول کر رہا تھا۔ میں کمپیوٹر کا ماہر نہیں ہوں۔ یور آنر" پریم چوپڑا نے اینٹھ کر کہا۔

وکیل گویل نے گلا صاف کیا اور جج کے قریب گئے۔"مسٹر چوپڑا کے بیان کو نظر میں رکھتے ہوئے اور پچھلے کچھ دن کے واقعات کی بنا پر جس میں بہت سے جوہری اور نوادرات کے بیوپاریوں کا نقصان ہوا ہے' یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ رام سنگھ روبوٹ کی حرکتوں پر نظر ڈالی جائے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ تمام وارداتیں رام سنگھ کو خریدے جانے کے بعد ہوئی ہیں۔ رام سنگھ کی یادداشت (میموری) کا ٹیپ ساری ضروری معلومات سے پردہ اُٹھا دے گا۔ میں عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ رام سنگھ روبوٹ کو عدالت میں بلایا جائے۔"

پریم چوپڑا کو جھٹکا لگا۔ یہ بات تو اُس نے سوچی ہی نہیں تھی۔ "روبوٹ عدالت میں حاضر" اگلے دن اخباروں کی سرخیاں تھیں۔ لوگوں نے پہلے کبھی ایسا نہیں سُنا تھا۔ وہ سب حیرت سے سوچ رہے تھے کہ بھلا روبوٹ کیا ثبوت پیش کرے گا' کیسی معلومات سے پردہ اُٹھائے گا۔

اگلے دن عدالت لوگوں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ لوگ روبوٹ کو گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ وکیل گویل آخری وقت تک اپنی بحث کے نکتوں پر غور کرتے رہے' وہ بہت پُر اعتماد اور چاق چوبند لگ رہے تھے مگر پریم چوپڑا کو بھی اتنا ہی بھروسہ اور یقین تھا۔ یہ مشینی آدمی کبھی بھی اپنے مالک سے دغا نہیں کر سکتا۔ عدالت کی کارروائی شروع ہوئی۔ رام سنگھ -070 گواہوں کے کٹہرے میں آکر کھڑا ہو گیا۔

"یور آنر" وکیل گویل نے شروعات کی' "مجھے سُپر روبوٹ کمپنی نے بتایا ہے کہ اس قسم کے

روبوٹ کی میموری کے ٹیپ میں گزرے ہوئے ہفتے کی ساری معلومات ہوتی ہے۔"

"مگر مقدمہ تو واردات کے پندرہ دن بعد شروع ہوا ہے۔ اس کا مطلب ضروری معلومات تو صاف ہو گئی ہو گی!" جج نے کہا۔ وکیل گویل ہلکے سے مُسکرائے' پریم چوپڑا کی طرف گھور کر دیکھا اور کہا۔ "جناب' تب سے اب تک روبوٹ بند کر کے رکھا گیا ہے۔ اُس نے کوئی کام نہیں کیا ہے۔"

" پریم چوپڑا کا منہ لٹک گیا مگر اُسے یقین تھا کہ رام سنگھ-070 اپنے مالک کا حکم مانے گا۔ اُس کا راز راز ہی رہے گا۔

"بحث جاری رکھیں" جج نے حکم دیا۔

وکیل گویل رام سنگھ روبوٹ کی طرف مڑے۔ "تمہارا مالک کون ہے؟" اُنہوں نے چھوٹا سا سوال کیا۔

ایک گہری نیلی روشنی جلی اور تھوڑی دیر گھر گھر کی آواز کے بعد روبوٹ اپنی مشینی آواز میں چیخ کو بولا۔ "مسٹر پریم چوپڑا۔"

"تم نے پریم چوپڑا کے لیے کیا کام کیے تھے؟"

ذرا سی دیر خاموشی رہی۔ پھر گھر گھر کی آواز آئی اور پھر جواب ملا۔ "صفائی کی' لان کی گھاس کاٹی' کپڑے دھوئے' برتن صاف کیے' بازار سے سامان لایا......"

"پچھلے چھ دن کے کاموں کو تفصیل سے یاد کرو" وکیل گویل نے بیچ میں ٹوکا۔ یاد داشت کا ٹیپ میکانکی طور پر مشینی انداز میں شروع ہو گیا۔ "کار کی ڈکی کھولی۔ بازار سے لایا ہوا کھانے پینے کے سامان رکھا۔ ڈکی بند کی' مڑا' تیس قدم چلا' رُکا' نوادرات کی دوکان بائیں ہاتھ پر تھی۔

ہدایت سگنل...... ٹیپ خالی ہے...... بائیں طرف چلا' مڑا' بیس قدم چلا......" اس موقعے پر وکیل نے ٹوک دیا۔ "رُکو' پیچھے جاؤ اور پھر سے ٹیپ چلاؤ۔" دوبارہ ہدایت کے سگنل کے بعد صاف وقفہ محسوس ہوتا تھا۔

وکیل گویل نے ٹیپ بند کر دیا۔ "اُس وقفے پر غور کیجئے' یور آنر کوئی ایسا کام ہے جس کا اظہار نہیں کیا گیا" یہاں کون سے ہدایتیں تھیں؟ وہ ہدایتیں کس نے دی تھیں؟" انہوں نے رام سنگھ-070 سے پوچھا۔

"اس معلومات کا اظہار نہیں کیا جا سکتا" اُس نے جواب دیا۔

"پر کیوں"

"روبوٹ اپنے مالک کے حکم کے خلاف کام نہیں کرتے"

"وکیل گوئیل نے اچٹتی نظروں سے پریم چوپڑا کو دیکھا جو ملزموں کے کٹہرے میں بے چین ہو رہا تھا۔ "یور آنر" وکیل نے جج کو مخاطب کیا" "وہ خاص ہدایتیں پریم چوپڑا نے دی تھیں۔ اُن کا منظر عام پر آنا ضروری ہے۔ کیونکہ نوادرات کی دوکان کے ملازموں کے مطابق یہ وہی تاریخ اور دن ہے جس وقت گنپتی کی قدیم اور قیمتی مورتی چُرائی گئی تھی۔"

"یہ ثبوت چوری کی واردات کی طرف اشارہ تو ضرور کرتا ہے مگر مجھے افسوس ہے کہ اُس کی
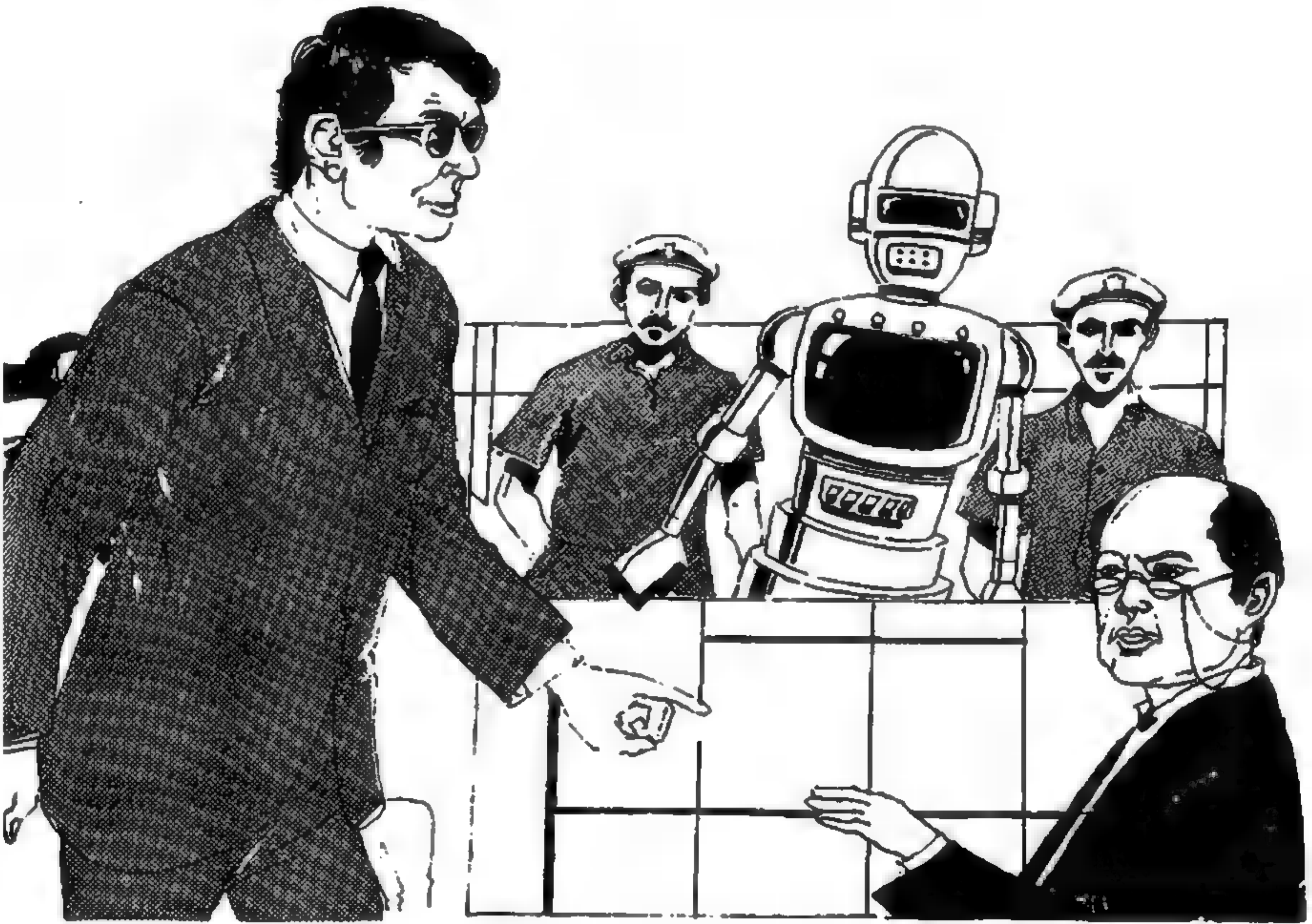
بنیاد پر سزا نہیں دی جاسکتی۔" جج نے کہا۔

وکیل گوئیل فکر میں ڈوب گئے۔ تبھی انہیں روبوٹ سازی کے تین اُصول یاد آئے۔ وہ رام سنگھ -070 کی طرف نئے جوش کے ساتھ مڑے۔

"رام سنگھ وہ ہدایتیں کیا تھیں؟" اُنہوں نے نرمی سے پوچھا۔

"اس معلومات کا اظہار نہیں کیا جاسکتا"

"اگر یہ ہدایتیں سامنے نہیں لائی گئیں تو اُن بہت سے لوگوں کو دُکھ پہنچے گا جن کا سامان چوری ہوا ہے۔ "وہ ہدایتیں کیا تھیں۔" وکیل گوئل نے بات کو بڑھاتے ہوئے کہا۔

"روبوٹ لوگوں کو تکلیف نہیں پہنچاتے۔" رام سنگھ -070 نے مشینی انداز میں جواب دیا۔

"رام سنگھ تمہیں ہدایتوں کو یاد رکھنا ہے" پریم چوپڑا نے کہا۔

"برائے مہربانی خاموش رہیے۔" وکیل گوئیل نے جھلا کر پریم چوپڑا کو دیکھا۔ "وہ ہدایتیں کیا تھیں؟" اُنہوں نے زور دے کر پوچھا۔

"اس معلومات کا اظہار نہیں کیا جاسکتا" رام سنگھ -070 نے ٹیپ رکاڈر کی طرح دوہرا دیا۔

"تم سمجھتے کیوں نہیں' رام سنگھ -070 وہ تمام لوگ جن کی چیزیں کھوئی ہیں اُن کا نقصان ہوگا...... مالی نقصان۔ اُن کو دُکھ پہنچے گا۔" وکیل گوئیل نے اپنی آواز اونچی کرلی۔ "اب بتاؤ وہ ہدایتیں کیا تھیں؟"

رام سنگھ -070 کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

"بہت سے' بہت سارے' لوگوں کو پریشانی ہوگی۔ بولو' بولو' رام سنگھ -070" وکیل گوئیل نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"نہیں رام سنگھ' نہیں" پریم چوپڑا گھبرا کر چلایا۔ مگر جج نے اُسے ڈانٹا "خاموش"

"بولو رام سنگھ -070" جج نے کہا۔ رام سنگھ -070 نے جھٹکے سے سر بائیں طرف موڑا پھر فوراً ہی جھٹکے سے دائیں طرف سر موڑ کر جج کو دیکھا۔

جواب دینے والی مشین کے سگنل یکایک بند ہوگئے۔ گھر گھر کھٹ کھٹ کی آوازیں آئیں جیسے رام سنگھ -070 میں کچھ ٹوٹ رہا ہو۔ ہلکی نیلی روشنی کا رنگ کچھ بیگنی سا ہوگیا۔

"اس معلومات کے نہ ملنے سے بہت سے لوگوں کو دُکھ پہنچے گا۔
بتادو رام سنگھ -070 بتادو۔" وکیل گویل نے پھر اپنی بات دوہرائی۔

کلک کی ایک آواز آئی جس سے پتا چلتا تھا کہ چلتا ہوا ٹیپ اٹک گیا ہے اور سگنل جام ہو گئے ہیں...... بیپ۔بیپ۔بیپ۔بیپ۔ کھڑ کھڑ کی آوازیں اور بیگنی روشنی تیز ہو گئی۔رام سنگھ روبوٹ کے ماتھے پر ایک لال روشنی جل اُٹھی جس کا مطلب تھا خطرہ۔جواب دینے والا سسٹم ناکارہ ہو گیا۔ اُس کے سینے کے بیچوں بیچ چھوٹے چھوٹے شٹر کھلے اور ایک چھوٹے سے .T.V سکرین پر لکھا ہوا دکھائی دیا "سسٹم بیکار ہو گیا ہے" رام سنگھ روبوٹ کا فیوز اڑ گیا۔ "ارے نہیں! نہیں!" سُپر روبوٹ کمپنی کا سیلزمین چلایا۔ "اس کا فیوز اڑ گیا یہ مر گیا" وہ گواہوں کے کٹہرے میں آکر آہستہ سے بولا۔

عدالت میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔جج، وکیل، پریم چوپڑا اور عدالت میں آئے ہوئے لوگ حیرت سے جیسے بت بن گئے تھے۔ سب کو بے حد افسوس بھی تھا۔سُپر روبوٹ کمپنی کے دو میکینک بے جان رام سنگھ -070 کو اُٹھا کر عدالت سے باہر لے گئے۔بھرائی ہوئی آواز میں سیلزمین نے سمجھایا "اس کے اندر ڈالی گئی ہدایتوں کا آپس میں ٹکراؤ ہو رہا تھا، کشمکش ہو رہی تھی۔اُس نے اپنے اُصولوں کے لیے اپنی قربانی دے دی...... "سیلزمین اپنے آدمیوں کے پیچھے پیچھے باہر چلا گیا۔

عدالت میں بہت دیر تک خاموشی رہی۔ وکیل گویل نے گلا صاف کیا اور سکوت توڑا "روبوٹ لوگوں کو نقصان نہیں پہنچاتے اور وہ اپنے مالک کی نافرمانی بھی نہیں کرتے۔ مسٹر پریم چوپڑا کی اُن ہدایتوں کا اُسے اظہار بھی نہیں کرنا تھا، مگر اُن کی وجہ سے خود اُس کے وجود کو بھی خطرہ ہو سکتا تھا۔ایک روبوٹ کی زندگی کے لیے خطرہ تھیں وہ۔اگر وہ اُن کے بارے میں بتادیتا تو اپنے مالک کی نافرمانی کرتا اگر نہ بتاتا تو دوسروں کو نقصان ہوتا۔اس کشمکش نے رام سنگھ کا خاتمہ کر دیا۔اُس نے جھوٹ بول کر انسانوں کو دُکھ پہنچانے کے بدلے خود ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا قبول کر لیا۔وہ اپنے مالک سے دغابازی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔" وکیل گویل کے چہرے پر اُداسی اور دُکھ کے اثرات نظر آرہے تھے۔اُنھوں نے اپنی فائل اُٹھائیں اور جج کے سامنے ذرا سا جھک کر عدالت سے چلے گئے۔

عدالت کی کارروائی جاری رہی۔ پریم چوپڑا کا جرم ثابت ہو گیا اور اُسے سزا ہوئی۔

تنکوں کا ڈھیر

اُس وقت پنکی باورچی خانے کی کھڑکی میں تھی جب اُس نے پہلی بار اُس چڑیا کو اڑتے ہوئے دیکھا۔ چھوٹی سی کالی اور بھوری چڑیا جس کے پروں پر چمکتے ہوئے سفید رنگ کے دھبے تھے۔ اُس کی چونچ میں کچھ تنکے دبے ہوئے تھے۔ پنکی نے جھانک کر دیکھنے کی بہت کوشش کی مگر کھڑکی کی سلاخوں نے اُسے روک لیا۔ وہ بس اتنا دیکھ پائی کہ چڑیا دور باورچی خانے کے دوسرے کونے کی طرف مڑی اور نظروں سے او جھل ہو گئی۔ اُسی وقت اُس کی نانی نے آواز دی۔

"پنکی، پنکی، تم نے اب تک اپنا بستر ٹھیک کیوں نہیں کیا؟"

"آتی ہوں، نانی" پنکی نے چیخ کر کہا۔ اُس نے باورچی خانے کا دروازہ بند کیا۔ دوڑ کر آنگن پار کیا اور جھپاک سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ "نانی، نانی، ابھی ابھی میں نے ایک چڑیا کو دیکھا ہے اُس کی چونچ میں تنکے دبے تھے ضرور وہ گھونسلا بنا رہی ہے۔"

نانی نے غصّے سے کہا "ہو سکتا ہے۔ پر ہمارے پاس چڑیوں کو دیکھنے کا فالتو وقت نہیں ہے چلو اب جلدی سے اپنا کمرہ صاف کرو۔"

"اچھا نانی" پنکی نے منہ بسور کر ہلکے سے کہا۔ اُس نے اپنا تکیہ اٹھایا اور اُسے جھٹک کر صاف کیا۔ کنکھیوں سے وہ نانی کو بھی دیکھ رہی تھی جو کونے میں الماری کی صفائی ستھرائی میں مصروف تھیں۔ نانی کی بات بھی ٹھیک تھی۔ ویسے نانی بہت اچھی ہیں۔ وہ اُس کے جیب خرچ میں کمی نہیں کرتیں، اور بہت مزے دار کھانا بناتی ہیں۔ مگر ڈانٹتی اتنا ہیں کہ سب ان سے ڈرتے ہیں ہاں امّاں کی بات الگ ہے۔ امّاں کو سب اپنا سمجھتے ہیں۔

پنکی نے جھٹ پٹ اپنا بستر تہہ کیا۔ جھاڑو دی اور دوڑ کر باورچی خانے میں پہنچ گئی۔ نانی نے ایک تھالی میں اُسے چاول پکڑا دیئے "اب یہ چاول صاف کر دو اور آلو چھیل دو، دوپہر کے کھانے کے

لئے۔" اُنھوں نے کہا۔ "اور چھٹیوں کے بعد جب تم اپنی امّاں کے پاس جانا تو اُن کی بھی مدد کیا کرنا۔"

تھالی ہاتھ میں لئے پنکی کھڑکی کے پاس جاکر کھڑی ہو گئی۔ وہاں وہ کالی بھوری اور چتکبری چڑیا پھر آگئی۔ اس کی چونچ میں پہلی بار سے ذرا لمبے تنکے دبے ہوئے تھے۔ پنکی نے اپنی گردن کو زیادہ سے زیادہ کھینچ کر اور جھک کر اُسے دیکھنے کی کوشش کی مگر پھر اُسے سلاخوں نے روک لیا۔ چڑیا دور باورچی خانے کے کونے میں مڑ گئی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ پنکی نے ایک لمبی سانس لی اور چاول چننے لگی۔

دوپہر کو کھانے کے بعد نانی نے باورچی خانہ صاف کیا اور سونے کے لئے لیٹ گئیں۔ پنکی انتظار کرتی رہی جیسے ہی نانی نے کروٹ لے کر دیوار کی طرف منہ کیا وہ دوڑ کر باورچی خانے میں گئی اور کھڑکی کے پاس اپنی خاص جگہ پر کھڑی ہو گئی۔ باورچی خانے کی الماری میں رکھی نانی کی پرانی گھڑی نے ٹک ٹک کر کے ایک منٹ گزار دیا مگر چڑیا نہیں آئی۔ پنکی کو پتہ تھا کہ نانی زیادہ دیر تک نہیں سوتی ہیں اور اگر وہ جاگ گئیں تو یوں آرام سے کھڑے ہو کر چڑیا کو دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اُس کی سمجھ میں ایک ترکیب آئی۔ چھت! وہ چھت پر سے چڑیا کو دیکھ سکتی ہے۔

جیسے ہی پنکی چھت پر پہنچی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اُسی ہوا کے جھونکے پر سوار اپنے پروں کا سفید رنگ چمکاتی 'کالی' اور بھوری چڑیا وہاں آگئی۔ ایک چھوٹا سا تنکا اُس کی چونچ میں دبا تھا۔ منڈیر کے اوپر سے اڑتی ہوئی وہ سیدھی چھت کے دوسرے کنارے پر بنے چھوٹے سے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اور کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کے اندر سے گزر کر کمرے کے اندر گھس گئی۔ تھوڑی دیر میں جب وہ باہر آئی تو تنکا اُس کی چونچ میں نہیں تھا۔ ایک سکنڈ کے لئے جیسے پنکی کی سانس رک گئی۔ "باپ رے!"

چڑیا نانا کے کمرے میں اپنا گھونسلا بنا رہی تھی۔

وہ تیزی سے آگے بڑھی "مت کرو ایسا" اُس نے چڑیا سے کہا جو ذرا سی دیر شاید آرام کرنے منڈیر پر بیٹھ گئی تھی۔ "میں تم سے کہہ رہی ہوں اپنا گھونسلا یہاں مت بناؤ۔" چڑیا ڈر کر اڑ گئی۔ مگر ذرا سی دیر میں پھر واپس آئی۔ کچھ اور تنکے اپنی چونچ میں دبائے۔ "ہش ہش" پنکی نے کہا۔ مگر چڑیا اس

سے بچتی ہوئی سیدھی ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے کمرے میں چلی گئی۔ اور بس اُسی وقت نیچے سے نانی نے آواز دی "پنکی، پنکی، تم کہاں ہو؟"

اُس دن سے پنکی چڑیا کو بھول نہیں سکی۔ اتنی ننھی منی مگر کتنی محنتی۔ مگر اُسے نانا کے کمرے میں ہی گھونسلا بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ ساری جگہیں چھوڑ کر' نانی یہ کبھی برداشت نہیں کریں گی...... نانا کے کمرے میں جانے کی تو کسی کو بھی اجازت نہیں۔

اُنھیں گزرے اب چار سال ہو گئے تھے مگر ان کی سب چیزیں وہاں ویسی کی ویسی ہی رکھی ہوئی تھیں۔ نانی اُنھیں بالکل صاف ستھرا رکھتی تھیں۔ ایک دو دن چھوڑ کر وہ کمرے میں اپنے ہاتھوں سے صفائی کرتیں' جھاڑ پونچھا کرتیں' پھر کیا چڑیا کا گھونسلا کمرے میں رہ سکتا ہے؟ مشکل ہے' شاید نانی گھونسلا اٹھا کر پھینک دیں۔ پچھلے سال انھوں نے آنگن کے طاق میں گھونسلا بنانے کی کوشش کرنے والے گوریوں کے جوڑے کے ساتھ بھی تو یہی کیا تھا۔ نانی کو صاف ستھرا گھر پسند تھا اور اس معاملے میں وہ بہت سخت تھیں۔

آنے والے دنوں میں پنکی بے بسی سے چڑیا کو چھت کے کمرے میں آتے جاتے دیکھتی رہی۔ کبھی کبھی پنکی کو اُس کی ساتھی مادہ چڑیا بھی نظر آتی۔ جو اُس سے کچھ چھوٹی تھی اور اُس کا رنگ خالی بھورا ہی تھا۔ اُس کے پروں پر سفید دھبے نہیں تھے۔ وہ دونوں اپنے بچوں کے واسطے گھر بنانے کے لئے کتنی محنت کر رہے تھے۔ کتنا ظلم ہو گا ان پر اگر نانی ایک دم یہ فیصلہ کر لیں کہ انھیں اٹھا کر باہر پھینکنا ہے۔ مادہ چڑیا پھر کہاں انڈے دے گی؟ لگتا ہے انڈے دینے کا وقت قریب ہے اور یہی وہ وقت ہے جب نانی کمرے کی صفائی کرنے والی ہیں۔ وہ لگ بھگ ہر ہفتے صفائی کرتی ہیں۔ پنکی نے سوچا اُسے چڑیوں کی مدد ضرور کرنا چاہیے۔ اُسے بس گھونسلا کمرے سے اٹھا کر باہر رکھنا ہو گا۔

مگر یہ اتنا آسان کام نہیں تھا۔ دروازے پر تالا لگا تھا اور اُس کی چابیاں ایک چھلے میں لگی حفاظت سے نانی کی ساڑی سے بندھی تھیں۔ اگلی صبح جب نانی نہانے کے لئے جا رہی تھیں پنکی آس پاس منڈلانے لگی۔ نانی نے چابیوں کا گچھا کھول کر اپنی میز پر رکھا اور غسل خانے میں چلی گئیں۔ پنکی نے ہوا کے تیز جھونکے کی طرح جھپٹ کر چابیاں اٹھائیں اور چھت کی طرف دوڑ پڑی۔

ناتا کے کمرے میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ بھری ہوئی الماریوں کے علاوہ وہاں ایک بڑا سا بک شیلف بھی تھا جو پوری دیوار کو گھیرے تھا۔ اُسی شیلف کے دوسرے سرے پر پنکی کو گھونسلا نظر آیا۔ اُس نے گھونسلے کے پاس پہنچ کر اُسے بڑی احتیاط سے ہتھیلیوں میں اٹھالیا اور تھوڑی دیر رک کر اُس کی خوبصورت پیالے جیسی شکل اور اُس پر بڑی صفائی سے لگائے ہوئے استر کی تعریف کرتی رہی۔

وقت بہت کم تھا۔ گھونسلے کو مضبوطی سے ہتھیلیوں میں سنبھالے وہ دوڑ کر کمرے سے نکلی۔ اُس نے بے چینی سے چاروں طرف نظریں دوڑائیں مگر گھونسلا رکھنے کے لئے وہاں کوئی مناسب جگہ نظر نہیں آئی۔ چھت بالکل سپاٹ تھی اور بس چھوٹی سے منڈیریں تھیں اور ایک طرف نیم کے پیڑ تک پہنچنا مشکل تھا۔

"ارے ہاں یاد آیا" پنکی چلائی۔ اُس نے گھونسلے کو ناتا کے کمرے کے باہری دیوار پر کھڑکی کی چوکھٹ کے پاس رکھ دیا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے کے بالکل نیچے۔ "یہاں ٹھیک رہے گا" اُس نے گھونسلے کو کونے میں ٹھیک سے جماتے ہوئے خوشی سے کہا۔ اور تالیاں بجا کر گھوم گھوم کر ناچنے لگی۔ پھر اُس نے کمرے کا تالا لگایا اور نیچے دوڑ گئی۔

اِس سے پہلے کہ نانی دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے باورچی خانے میں آتیں پنکی کو باورچی خانے کی کھڑکی کے باہر میدان میں کالی اور بھوری چڑیا دکھائی دی۔ "ارے تمھیں بہت حیرت ہونے والی ہے" اُس نے خوشی خوشی چڑیا کو بتایا اور مسکرا کر اُسے اڑ کر دور جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

اُس دن پنکی دوبارہ چھت پر نہیں گئی۔ دل تو بہت چاہتا تھا مگر اُس نے سوچا اُس کو دیکھ کر چڑیاں ڈر جائیں گی۔ مگر اُس کے اندر کا جوش گانے کی شکل میں سامنے آتا رہا۔ وہ جیسے ہوا میں اڑتی رہی۔ اور یہ سوچ کر مطمئن تھی کہ اُس نے چڑیا کے بچوں کے آنے والے کل کو محفوظ بنادیا ہے۔ آج وہ اپنے بستر پر آرام سے سوئی۔

اگلے دن سویرے ہی نانی نے اعلان کیا کہ وہ ناتا کا کمرہ صاف کرنے جارہی ہیں۔ پنکی اُچھل پڑی۔ خوش قسمتی سے اُس نے ایک دن پہلے ہی گھونسلا ہٹالیا تھا۔ نانی جھاڑن لے کر چل پڑیں۔ پنکی پیچھے پیچھے گئی۔ جوش میں وہ پنجوں کے بل چل رہی تھی۔ چھت پر پہنچتے ہی وہ تیر کی طرح کھڑکی کے

پاس گئی۔ گھونسلا وہیں تھا' بالکل وہیں جہاں اُس نے چھوڑا تھا مگر وہ خالی تھا اُس میں نہ انڈے تھے نہ چڑیاں۔

پنکی نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ چھت کے دوسرے سرے پر مادہ چڑیا منڈیر پر چپ چاپ بیٹھی دکھائی دی۔

"سنو" پنکی نے پکارا "تم گھونسلے میں کیوں نہیں بیٹھیں؟ وہ وہاں ہے تمھارا انتظار کر رہا

ہے۔"

مگر چڑیا نے پر پھڑ پھڑائے اور اڑ کر نیم کے پیڑ کے پیچھے غائب ہو گئی۔ تبھی نانی تیزی سے کمرے سے نکلیں اور چلائیں "پنکی' آؤ اور صفائی میں میری مدد کرو۔"

پنکی ان کے پیچھے پیچھے اندر چلی گئی۔ شیلف پر' بالکل اُسی جگہ پر جہاں گھونسلا تھا ایک انڈا پڑا تھا۔ جس پر بھوری اور سفید چتیاں پڑی تھیں۔ بہت ہی خوبصورت اور نازک لگتا تھا مگر وہ چٹخا ہوا تھا نیچے فرش پر ایک انڈا اور پڑا تھا۔ نہیں بلکہ دو' دونوں پھوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ "کیسی بیوقوف چڑیا ہے بغیر گھونسلا بنائے انڈے دے دیئے۔" نانی کہہ رہی تھیں۔

پنکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔"چڑیا نہیں نانی۔ میں نے کیا ہے یہ۔ یہ میری غلطی ہے" اُس نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپالیا اور سسکیاں لیتی ہوئی فرش پر بیٹھ گئیں۔ اُسے بہت دکھ ہو رہا تھا مگر تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک حیرت ناک بات ہوئی۔ نانی نے پنکی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر بہت ہی پیار سے کہا" روؤ مت مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟"

تھوڑی تھوڑی کر کے ساری کہانی سامنے آ گئی۔ نانی نے ساری کہانی سنی' لمبی سی سانس لی اور کہا۔ "پیاری بٹی' مجھے سچ مچ بہت افسوس ہے' مگر ان جنگلی جانوروں کی زندگی میں ہم دخل نہیں دے سکتے۔" وہ پنکی کا سر تب تک سہلاتی رہیں جب تک اُس کی ہچکیاں نہ رک گئیں۔ "اب پریشان مت ہو' یہ چڑیاں ہر سال آتی ہیں" انھوں نے دلاسا دیا" اگلے سال پھر آئیں گی' پھر گھونسلا بنائیں گی اور گھونسلا بھر کر بچے نکلیں گے۔"

آپ گھونسلا ہٹائیں گی تو نہیں" پنکی نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"نہیں' چاہے وہ تمھارے نانا کے کمرے میں ہی کیوں نہ ہو۔"

"وعدہ؟" پنکی نے پوچھا۔

"وعدہ" نانی نے کہا۔

پنکی نے اپنا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اوپر اٹھایا اور جھپٹ کر زور سے نانی سے لپٹ گئی۔ اور آہستہ سے بولی "شکریہ نانی' شکریہ۔"

دادی ماں کی چھڑی

جیسے ہی دادی ماں ممبئی ایئر پورٹ کے شیشے کے دروازے سے وہیل چیئر پر بیٹھی باہر آئیں، مجھے اور گووند کو سب سے پہلے جو چیز نظر آئی وہ اُن کے ہاتھ میں دبی چھڑی تھی۔

دادی ماں تھوڑے دن کے لیے گوپال چاچا کے پاس دو بئی گئی تھیں۔ ایک ہفتے بعد وہ وہاں گر گئیں اور اُن کے بائیں کولھے کا مصنوعی جوڑ ڈھیلا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے اُنہیں بے حد درد اور پریشانی ہو گئی۔

ہڈیوں کے ڈاکٹر کے مشورے پر چاچا نے اُنہیں ایک چھڑی اور درد کم کرنے والی دوائیں لادیں اور جو پہلی فلائٹ ملی اُس میں بٹھادیا، تاکہ وہ اپنے ڈاکٹر کو جا کر دکھالیں جس نے تین سال پہلے اُن کے کولھے کا آپریشن کیا تھا۔

گھر تک آتے آتے سارے راستے ہماری آنکھیں چھڑی پر جمی رہیں۔ ہم دونوں دادی ماں کے دونوں طرف بیٹھے تھے اور چھڑی ہماری ٹانگوں پر رکھی تھی۔ ہم اُس کی چمکتی ہوئی چکنی سطح پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور اُس پر لگے چمکتے ہوئے تین سنہرے پھولوں کو شوق سے دیکھ رہے تھے۔

"کیا یہ اصلی سونا ہے؟" گووند نے پوچھا۔

"نہیں یہ پیتل ہے اصل میں یہ چھڑی تین ٹکڑوں میں ہے جو پیچ سے جوڑ دیے گئے ہیں۔ اور پتہ ہے، چاچا نے اِسے کوڑیوں کے دام خریدا ہے۔ صرف بیس درہم میں!"

"کمال ہے" ہم نے چلا کر کہا۔

"کل ہم لوگ چور پولس، کھیلیں گے۔ آدی!" گووند نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا"

کار چلاتے ہوئے پاپا نے ڈانٹا!" آدتیہ اگر میں نے تم لڑکوں کو دادی کی چھڑی کے پاس بھی دیکھا تو سمجھ لو تمہاری خیر نہیں، سمجھ گئے؟"

"جی پاپا۔"

دو دن بعد دادی ماں کا آپریشن ہو گیا۔ اماں اُن کے ساتھ نرسنگ ہوم میں رہیں۔ اُنہوں

نے چھڑی دیدی کو دے دی۔ "اس کو ایسی جگہ چھپا دینا جہاں وہ دونوں شیطان اسے ڈھونڈ نہ پائیں۔ اور پڑھائی میں دل لگانا تمہارے بورڈ کے امتحان ہونے والے ہیں" انھوں نے دیدی کو ڈرایا۔

ایک ہفتے بعد نرسنگ ہوم میں دادی ماں کے کمرے میں، میں اور گووند بے دھڑک گھستے چلے گئے اور جوش سے چلائے "دادی ماں آپ کو پتہ ہے آپ کی چھڑی میں سونا ہے؟"

"کیا" دادی ماں کمزور سی آواز میں بڑبڑائیں۔

میں نے اُن کے کان میں سرگوشی کی "آپ کی چھڑی میں سونا ہے، دادی ماں، سونے کی زنجیریں۔"

مگر دادی ماں پر ابھی تک نیند کی گولیوں کا اثر تھا۔ اس لیے وہ سو گئیں۔ "دادی ماں کو تنگ مت کرو" اماں نے ہمیں وہاں سے ہٹاتے ہوئے کہا "مضبوط لکڑی کی چھڑی میں سونا کیسے ہو سکتا ہے......؟ تم لوگوں نے خواب دیکھا ہو گا"

"مگر اماں اُس میں سونا ہے!" گووند سنجیدہ ہو گیا۔

"تمہیں چھڑی کیسے ملی"

"وہ ایسا ہوا اماں کہ ہم خاموشی سے اپنے کمرے میں بیٹھے پڑھ رہے تھے کہ ہم نے دیکھا کہ کئی گائیں کمپاؤنڈ میں گھس گئیں۔ کسی بیوقوف نے گیٹ کھلا چھوڑ دیا تھا۔" میں نے اُنہیں بتایا۔

"دیدی نے جھٹ سے ہمیں دادی ماں کی چھڑی پکڑا دی" گووند نے بات آگے بڑھائی۔

"اگر ہم اُن کو نہیں بھگاتے تو وہ آپ کے سارے نئے پودے چبا ڈالتیں اور آپ ہماری بُری حالت کر دیتیں۔"

اماں نے خوش ہو کر اُس کے گال نوچے اور اُس نے دانت نکال دیے۔

میں نے آگے بات شروع کی۔ "دیدی نے ہم سے کہا کہ چھڑی کو واپس الماری کے اوپر رکھ دو اور وہ خود آرتی کے گھر پڑھنے چلی گئیں۔

عین اُسی وقت مدن آ گیا اور ہمارے پیچھے پڑ گیا کہ ہم اُس کو بھی چھڑی دکھا دیں۔ ہم نے کہا 'نہیں' مگر وہ ضد کرنے لگا۔ آخر ہم نے پیچ کھول کر چھڑی کے حصے الگ الگ کیے اور اُسے دکھا

دیئے۔"

"پھر"

"چلو تھوڑی دیر چور۔ پولس، کھیلیں، یار! پلیز یار" اُس نے کہا۔ گووند نے مدن کی نقل اُتارتے ہوئے کہا۔

"مدن کے پاس ہینڈل والا اوپر کا حصّہ تھا۔ اور ہم دونوں کے پاس باقی دو حصّے تھے۔ وہ اور گووند پولس تھے اور میں چور" میں نے سمجھایا۔

"ہم اُسے ہینڈل والا کیسے لینے دیتے!" لڑائی میں اُس کے ہاتھ سے چھڑی چھوٹ گئی اور دھپ سے سمینٹ کی فرش پر گر گئی۔ "گووند نے سارا منظر خوب اشارے کر کر کے بیان کیا۔

"جب میں نے چھڑی کو اُٹھایا، تو مجھے ہینڈل ڈھیلا لگا۔ میں نے مدن کو بہت بُرا بھلا کہا مجھے یقین تھا کہ وہ ٹوٹ گئی ہے اور ہماری مصیبت آ گئی ہے۔ میں نے قسم کھائی کہ اب چھڑی سے کبھی نہیں کھیلوں گا۔"

"کسی کو پتہ نہیں تھا کہ ہینڈل الگ سے لگا ہوا تھا، پھر میں نے گھما کر اُسے کھولا تو وہاں ایک ٹیوب نکلا۔"

"کیا؟"

"ہاں، اماں، ایک شیشے کا ٹیسٹ ٹیوب، ہینڈل سے جڑا تھا اور چھڑی کے اوپر والے حصے میں رکھا تھا، جو اندر سے کھوکھلا تھا۔" میں رُکا "اور ٹیسٹ ٹیوب کے اندر ایک درجن زنجیریں رکھی تھیں!" میں نے ڈرامائی انداز میں بات ختم کی۔

"کہاں ہیں وہ زنجیریں اب؟"

"جیسے ہی ڈیڈی واپس آئیں اور ہماری کہانی سُنی فوراً انہوں نے تالے میں بند کر دیں۔"

"یہ ضرور کسی اسمگلر کا کام ہے۔" گووند نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"مگر دادی ماں کی چھڑی میں کیوں؟"

"اوہ، اماں، آپ نہیں سمجھیں!؟ صاف بات ہے ضرور ایک طرح کی دو چھڑیاں ہوں گی

اور بس وہ کسی طرح آپس میں بدل گئی ہوں گی" میں نے کندھے اُچکا کر کہا۔

"ارے ہاں۔ دادی ماں مجھے ایک شریف سے بوڑھے سردار کے بارے میں بتا رہی تھی جو اُن کے پاس بیٹھا تھا۔ اُس کے پاس بھی بالکل اُن کی جیسی ہی چھڑی تھی۔"

"دیکھا میں نے کہا تھا نا"

جب ہم گھر لوٹے تو دیدی نے ہمیں بتایا کہ پاپا دیر سے گھر آئیں گے۔ اُسی دن شام کو جب ہم مدن کے ساتھ بیٹھے دادی ماں کی چھڑی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے، ہمیں گیٹ کھلنے کا کھٹکا سنائی دیا۔ مُڑ کر دیکھا تو ایک بوڑھا آدمی ہلکے ہلکے ہماری طرف آ رہا تھا۔

اُس کے سر پر پگڑی بندھی تھی اور سفید لمبی داڑھی اور مونچھیں تھیں...... اور اُس کے ہاتھوں میں ایک چھڑی تھی۔

"آدتیہ، دیکھو، بالکل دادی ماں جیسی ہی ہے وہ" گووند نے سرگوشی کی۔

"چپ رہو! بے وقوف۔" میں نے اُسے کہنی مار کر کہا "مجھے لگتا ہے ہم صحیح راستے پر جا رہے ہیں۔ میں سنبھال لوں گا۔ تم لوگ اپنی چونچ بند رکھنا...... سمجھے!"

"لڑکو! کیا مسز دیش پانڈے یہیں رہتی ہیں؟" بوڑھے آدمی نے ہمارے پاس پہنچ کر پوچھا۔

"جی ہاں، مگر اس وقت ■ یہاں نہیں ہیں۔ آپ بتایئے کیا کام ہے آپ کو۔" میں نے بہت شرافت سے پوچھا۔ "کوئی خاص کام نہیں۔ میں اُن سے ہوائی جہاز میں ملا تھا سوچا اُن سے ملاقات کر لوں۔ پھر کسی دن آؤں گا۔ چلتا ہوں!"

وہ جانے کے لیے مُڑا۔ "ارے نہیں جناب، اندر تو تشریف لایئے، اور کچھ ٹھنڈا پیجئے۔ بہت گرمی ہے۔" میں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو آنکھ مار کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ کیا تم اُن کے پوتے ہو؟"

ہم نے گردن ہلا کر ہاں کہی۔ اور وہ ہمارے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ میں نے ساتھیوں کو اُس پر نظر رکھنے کا اشارہ کیا، اور اندر جا کر اُس کے لیے ایک گلاس سنترے کا جوس لے آیا۔

جوس پی کر اُس نے ہمارا شکریہ ادا کیا اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

"اتنی جلدی بھی کیا ہے 'اسمگلر صاحب!" مدن نے اُسے دھکّا دے کر صوفے پر بٹھاتے ہوئے حقارت سے کہا۔

"اسمگلر"؟ بوڑھے نے غصّے سے پوچھا۔

"تم دادی ماں کی چھڑی لینے آئے تھے۔ ہے نا!؟" گووند نے اپنے پسندیدہ فلمی ہیرو کی نقل

کرتے ہوئے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"چھڑی؟ کیوں؟ ہاں اوہ غلطی سے میری چھڑی لے آئی تھیں۔ اس لیے میں......"

"ہاں' ہاں' اور شاید اُس میں تمہارا مال رکھا ہے؟" میں نے فقرہ کسا۔

"مال؟ کیسا مال!" بوڑھا غصے میں کھڑا ہو گیا۔

"اوہو! تمہیں نہیں معلوم' واقعی؟ بدمعاش!" گووند نے اُسے گھور کر دیکھا' اور پھر ہم تینوں اُس سے لپٹ گئے وہ نکل بھاگنے کی کوشش کرتا رہا مگر ہم نے اُسے صوفے میں جکڑ لیا۔

"پکڑے رہنا" میں نے اُس کے سر سے پگڑی اُتارتے ہوئے کہا۔

بدحواس بوڑھے نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر چھپا لیا اور ہم لوگوں سے التجا کی کہ ہم اُس کے بال نہ کھینچیں۔ ہم نے جھٹکے سے اُس کے ہاتھ نیچے کیے اور اُس کی پگڑی سے اُسے باندھنا شروع کر دیا۔

"میری بات کا یقین کرو' میں صرف تمہاری دادی سے ملنا چاہتا تھا" اُس نے کہا۔

"اوہو' واقعی؟ اچھا تب تمہیں کیسا لگے گا جب پولس تم سے ملے گی؟"

میں نے اُسے دھمکاتے ہوئے کہا۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟" ایک آواز گونجی۔ یہ پاپا تھے۔

"ہم نے پوری تفصیل سے اُنہیں سارے دن کا قصہ سنایا۔

"یہ ہے ہمارا قیدی' پاپا" میں نے اپنی جیت کی خوشی میں اکڑ کر کہا۔ "اب ہم پولس کو بلا سکتے ہیں۔"

"انو' راودھا کہاں ہے؟"

"دیدی بائی کے ساتھ بازار گئی ہیں۔ وہ لوگ بس آتے ہی ہوں گے۔"

"جناب' یہ سب غلطی سے ہوا ہے۔ آپ کے بھائی نے اور میں نے دو بئی میں ایک ہی دوکان سے چھڑیاں خریدیں۔ بعد میں اُن سے میری ملاقات ہوائی اڈے پر ہوئی۔ اُنہوں نے مجھ سے اپنی اماں کا دھیان رکھنے کے لیے کہا۔ میں اپنی چھڑی واپس لینے اور اُن کی چھڑی دینے آیا تھا جو میں

نے غلطی سے اُٹھائی تھی۔ میرے نام کا پہلا حرف 'O' ہینڈل پر لکھا ہے۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔ اب مجھے جانے دیجئے۔" قیدی نے صفائی پیش کی۔

پاپا نے ہینڈل کا معائنہ کیا" ہاں' لکھا تو ہے' مگر اُس میں سونے کی زنجیریں کہاں سے آ گئیں؟" اُنھوں نے چھڑی کھول کر اُسے آزاد کرتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

سب مڑ کر دیدی کو گھورنے لگے جو چپ چاپ اندر آ گئی تھیں اور ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔

ایک دم سناٹا چھا گیا۔ دیدی نے کہنا شروع کیا" میں نے ٹیوب میں زنجیریں رکھی تھیں۔ ویسے وہ صرف سونے کی پالش والی پیتل کی زنجیریں ہیں۔ بازار میں درجنوں کے حساب سے ملتی ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر تم لوگوں کو چھڑی دی تھی مجھے معلوم تھا کہ تم لوگ اُس سے کھیلو گے اور جب ہینڈل ڈھیلا لگے گا تو اُسے ضرور کھولو گے۔ پہلے مجھے بھی نہیں پتہ تھا کہ ہینڈل الگ سے لگا ہے۔ مجھے تو تب پتا چلا جب الماری پر رکھتے وقت چھڑی میرے ہاتھ سے گر گئی تھی۔ مجھے ہینڈل ڈھیلا لگا اور میں نے اُسے کھول دیا۔ تبھی مجھے یہ شرارت سوجھی۔ آج اپریل فول ہے "گدھو!" اپنی بات ختم کر کے وہ زور زور سے ہنسنے لگیں۔

"چپ ہو جاؤ" پاپا چیخے۔ "تو یہ تمہارا مذاق ہے! تمہیں احساس ہے کہ اس بیچارے آدمی کو کتنی تکلیف ہوئی ہے؟ اور لڑکو' تم' تم پولس کو بلانا چاہتے تھے' جب کہ اب ان شریف آدمی کو پورا حق ہے کہ یہ تمہیں پولس کے حوالے کر دیں اور......"

بوڑھے نے بیچ میں ٹوک دیا" جانے دیجئے جناب سچ کہوں تو مجھے بھی بہت مزا آیا...... اور پھر بہت دن سے اس راستے پر اسمگلنگ کا بہت زور ہے۔ اس لیے ان لوگوں کا مجھ پر شک کرنا کافی حد تک ٹھیک ہی تھا۔ شاباش لڑکو۔ اگلی بار ضرور تمہاری قسمت ساتھ دے گی!"

"جناب مجھے معاف کر دیجئے" دیدی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مذاق کا یہ انجام ہوگا۔" ہم نے بھی معافی کی درخواست کی اور پاپا نے بھی بہت بہت معافی مانگی اور شریف آدمی کو کار میں بٹھا کر دادی ماں سے ملانے اور گھر چھوڑنے کی پیشکش کی۔

کار میں بیٹھتے بیٹھتے بوڑھے نے اپنا کارڈ نکال کر دیا "جاسوس اوم پرکاش آپ کی خدمت میں حاضر ہے" اُس نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے جھک کر کہا۔

اور پھر سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جب اس نے اپنی وگ مونچھیں اور داڑھی نوچ کر اُتار دیں اور خوش مزاجی سے ہاتھ ہلاتا ہوا کار میں بیٹھ گیا۔
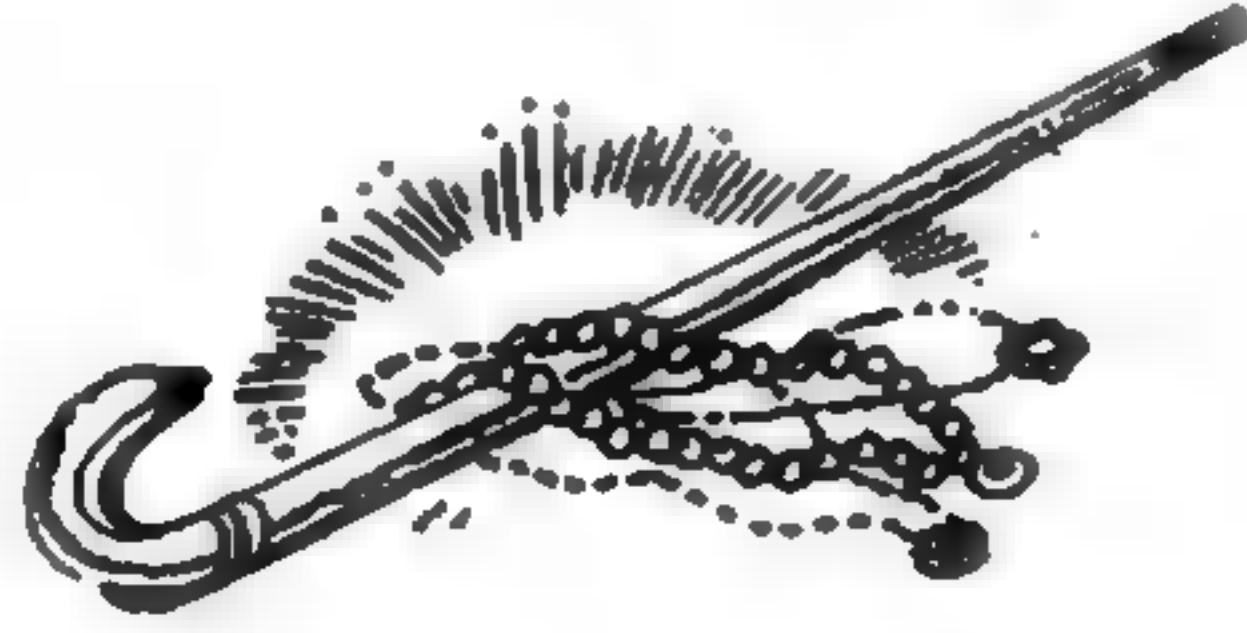
آسمانی دوست

مارچ کے مہینے کے یہ وہ دن تھے۔ جب ہوا نہ جانے کہاں سے چلنا شروع ہوتی ہے۔ اور تیز آندھی بن جاتی ہے۔ صبح سے ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں اور آسمان پر تیزی سے بادل چھائے جا رہے تھے۔ تیز ہوا سے پیڑوں کی چھوٹی چھوٹی شاخیں ٹوٹ کر گر رہی تھیں اور ان کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ پرانی سوکھی پتیاں ہوا میں اڑتی پھر رہی تھیں۔

مِنی اپنی پہلے منزل کے فلیٹ کی بالکنی میں "وہیل چیئر (پہیوں والی کرسی) پر بیٹھی باہر پارک میں کھیلتے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ بچوں کو تیز ہواؤں اور لہروں پر گرتی نیم کی پیلی پیلی پتیوں کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ سب تو اپنے کھیل میں مست تھے۔

"مِنی اندر آجاؤ" اُس کی ممی نے باورچی خانے سے آواز دی۔

"ایک منٹ ممی۔" مِنی نے کپکپاتی آواز میں کہا اور وہیل چیئر میں زور لگا کر آگے جھکی' اور نیچے کھیل دیکھنے لگی۔

اُس کی ممی باہر بالکنی میں آگئیں۔ "مِنی گویا' ہوا بہت تیز چل رہی ہے۔ باہر بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔ چلو اندر چلو۔ اچھی بیٹی ہے میری۔"

مِنی اُسی طرح بالکنی سے جھانکتی رہی۔ "بس ذرا سی دیر۔" اُس نے ضد کی۔

اُس کی ممی نے پارک میں کھیلتے بچوں کو دیکھا۔ لمبی سی ٹھنڈی سانس لی۔ اور اندر جاتے ہوئے بولیں "دھیان رکھنا۔ بارش شروع ہونے سے پہلے ہی اندر آجانا میں نہیں چاہتی کہ تم بھیگو۔"

مِنی بارہ سال کی تھی۔ اور معذور تھی۔ (Spastic) اسپاسٹک' وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے ہاتھ پیر پیدائشی طور پر اُن کے قابو میں نہیں ہوتے۔ مِنی چل نہیں سکتی تھی' اپنی قمیص کے بٹن بھی نہیں لگا سکتی تھی مگر وہ گھِسٹ گھِسٹ کر چل سکتی تھی۔ اور اُس نے دانت صاف کرنا اور چمچے کی مدد سے کھانا سیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی وہیل چیئر بھی خود چلا لیتی تھی۔ وہ ایک خاص طرح کے اسکول میں

جاتی تھی جہاں اُسے کچھ خاص قسم کی کسرت کرائی جاتی تھی۔ اور بولنے کی مشق کرائی جاتی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہی سب مضمون پڑھائے جاتے تھے جو سب بچے اسکول میں پڑھتے ہیں۔ مگر ہنی کے کوئی دوست نہیں تھے۔ چھے مہینے ہوئے جب سے اس گھر میں آئی تھی۔ مگر اب تک کوئی ایسا نہیں تھا جو ہنی کے ساتھ کھیلے۔ پڑوس کے سارے بچے اپنے اپنے کھیلوں اور اسکول میں مصروف رہتے تھے۔ اور انھوں نے ہنی سے دوستی نہیں کی تھی۔ وقت گذارنے کے لئے ہنی کا سب سے اچھا مشغلہ بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھنا تھا۔

بارش کی بڑی بڑی بوندیں گرنے لگیں مگر بچے اپنے کھیل میں لگے رہے۔ بڑی سی لال گیند اوپر نیچے اچھلتی رہی۔ اچانک بچوں کے بیچ ایک اور گیند آگئی۔ ایک ننھی سی رنگ کی گیند۔ لڑکیوں نے چیخیں ماریں اور لڑکے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگے۔ ایک لڑکا گیند کو چھونے کے لئے جھکا۔ تبھی اچانک اسی نے پر پھڑ پھڑائے اور اڑ گئی اس سے پہلے کہ ہنی کی کچھ سمجھ میں آتا کہ کیا ہوا' ننھی گیند اُڑتی ہوئی اُس کی بالکنی تک آگئی اور اُس کی گود میں اتر گئی۔

مارے حیرت کے ایک پل تو ہنی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ جب ذرا سنبھلی تو دیکھا کہ اُس کی گود میں جو چیز ہے وہ گیند نہیں ایک چڑیا ہے جو ڈر کے مارے سکڑی سمٹی اُس کی گود میں بیٹھی ہے۔ بارش اب اور تیز ہو گئی تھی۔

"ہنی" اُس کی ممی چلاتی ہوئی باہر آئیں تاکہ اُس کی کرسی دھکیل کر اُسے اندر لے جائیں۔

"یہ کیا ہے؟" وہ چڑیا کو دیکھ کر حیرت سے بولیں۔

"ممی! یہ ایک بلبل ہے۔ آسمان سے آئی ہے یہ۔" ہنی نے ہلکے سے کہا۔

یقیناً وہ چڑیا بلبل ہی تھی۔ (شوویلر) ٹھنڈے شمالی حصے سے ہر سال ہندوستان آنے والا ایک مہمان' شاید وہ اپنے غول کے ساتھ اپنے وطن واپس جا رہی ہو گی۔ مگر تیز ہوا کی وجہ سے اپنا راستہ بھول گئی ہو۔ اپنے ساتھیوں سے دوبارہ جا ملنے کی دیوانہ وار کوشش میں اُس کے بازوؤں میں چوٹ لگ گئی۔

وہ ایک خوبصورت جنگلی بلبل تھی۔ اُس کے جسم کا نچلا حصہ ملائم اور مخملی تھا۔ اور اس کی چونچ پھاوڑے کی طرح چوڑی سی تھی۔ اُس کے پر چمکیلے' نیلے' سفید اور بھورے تھے۔ اُس وقت وہ بے حد

تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔

مینی کی ممی نے اُسے اُٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن اُس نے اچانک ان کے ہاتھ میں ٹھونگ

ماردی۔ "ہائے" وہ چلائیں۔ اور اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

وہ ایک دم تڑپی۔ اور لڑھک کر کمرے کے ایک کونے میں جا کر سست کر بیٹھ گئی۔

ساری شام مینی اور اُس کی ممی بلبل کو کچھ کھلانے کی کوشش کرتی رہیں اُنھوں نے اُس کے سامنے روٹی کے ٹکڑے۔ پھلیاں اور پھل سب کچھ رکھا مگر اُس نے کوئی چیز چھوئی تک نہیں۔

"ممی اُسے کچھ پکے چاول کچل کر دودھ کے ساتھ دیجئے۔" مینی نے مشورہ دیا۔

اُس کی ممی نے ایک پیالے میں پکے ہوئے چاول ڈال کر کچلے اور دودھ شکر ملا کر چڑیا کی چونچ کھول کر روشنائی بھرنے والے ڈراپر سے اُسے کھانا کھلایا۔

جیسے ہی اُس کے پیٹ میں کچھ کھانا گیا۔ بلبل کچھ چاق چوبند سی لگنے لگی۔ اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اور اُس نے اپنے پر کھولنے کی کوشش بھی کی۔ مگر ایک دوبار کوشش کرنے کے بعد ٹال گئی۔

"مجھے معلوم ہے اس کا نام کیا ہے؟" بترا نام ہے اس کا مینی نے کہا اور اس کی ممی مسکرادیں۔

"ہم بترا کو کہاں لٹائیں مینی؟" اُس کے پاپا نے اُس سے پوچھا۔

"پاپا" میں چاہتی ہوں یہ میرے پاس رہے۔ شاید اُسے رات میں میری ضرورت پڑے۔" مینی نے کہا۔ آخر انھوں نے بترا کو ایک تنکوں کی ٹوکری میں بٹھا کر مینی کے پلنگ کے پاس رکھ دیا۔

مینی کی امیدوں کے خلاف بترا نے رات میں اُسے بالکل نہیں جگایا۔ جب صبح سویرے اُس کی آنکھ کھلی تو مینی کو پہلا خیال یہی آیا کہ پلنگ کے پاس رکھی ٹوکری میں جھانک کر دیکھے۔ مگر ڈر اور گھبراہٹ سے اُس کا حال خراب ہو گیا جب اُس نے دیکھا کہ ٹوکری خالی ہے۔

"بترا! بترا" مینی ایک کہنی کے بل اٹھ کر چلائی اور اُس نے دیکھا کہ وہ باتھ روم میں سے آنکھیں چمکا چمکا کر اُسے دیکھ رہی ہے۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

بلبل بس پھدک پھدک کر چل پاتی تھی۔ حالانکہ وہ اُڑنے کی جان توڑ کوشش بھی کر رہی تھی۔ جب مینی گھسٹ گھسٹ کر اُس کے پاس پہنچی تو اُس نے پر پھڑ پھڑائے اور پھدک کر دور چلی گئی۔

مینی نے بڑی مشکل سے جب اُسے پکڑا تو اُس نے فوراً ٹھونگ ماردی۔

"مینی! کیا ہوا؟" اُس کی ممی گھبرا کر چلائیں اور کمرے میں آگئیں۔ مگر جب انھوں نے بلبل

کو اپنی بٹی کے بازوؤں میں دیکھا تو ان کی گھبراہٹ خوشی میں بدل گئی۔ میں تمھارے لئے اور تمھاری دوست کے لئے ناشتہ لائی ہوں۔ انھوں نے اعلان کیا۔

جب منی بتر اکو دبوچ کر اُسے اُس کا ناشتہ کھلانے کی کوشش کر رہی تھی تو دروازے کی گھنٹی بجی۔ جیسے ہی منی کی ممی نے دروازہ کھولا تو بچوّں کی ایک ٹولی نے اُن کو نمستے کہا۔ وہ سب اپنے اسکول کا صاف ستھرا یونیفارم پہنے ہوئے تھے۔ "آنٹی" کیا ہم چڑیا دیکھ سکتے ہیں؟ اُنھوں نے پوچھا۔

بتر اکو ڈراپر سے کھانا کھاتا دیکھ کر بچوں کو بہت حیرت اور خوشی ہوئی۔ انھوں نے اُسے پکڑنے میں منی کی مدد کی۔ اسکول کی بس پکڑنے کے لئے انھیں جلدی جانا تھا۔ "ہم دوپہر میں پھر آئیں گے منی۔" اُنھوں نے کہا۔ منی بھی اسکول جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

"بیچاری بطخ؟ اپنے دوستوں کو کتنا یاد کر رہی ہو گی؟" شام کو بچوّں میں سے ایک لڑکے بنٹی نے بطخ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب تو اُس کے لئے نئے دوست بنانا اور بھی مشکل ہے۔ کیونکہ اب یہ لولی ہو گئی ہے" انجو نے کہا۔ اور کہنے کے کچھ دیر بعد اُسے خیال آیا کہ اُس نے کیا کہہ دیا' تو جلدی سے اُس نے منہ دبالیا۔

"ہم اُسے طاقت ور بنائیں گے۔" منی نے کہا۔

اس واقعے کے بعد پڑوس کے بچے منی کے بہت اچھے دوست بن گئے۔ آخر کار بچوں کو احساس ہو ہی گیا کہ منی کے ساتھ نہ کھیلنے سے اُسے کتنی تکلیف ہوتی ہو گی۔

اگلے دن انجو اپنے ساتھ ایک موٹی سی کتاب لائی۔ "دیکھو بطخوں کے بارے میں سب کچھ تم اُس میں سے پڑھ سکتے ہو۔" بتر ا 'شاویلر' کہلاتی ہے۔" بچوں نے خوش ہو کر اُسے گھیر لیا۔ اور شاویلر ز کی عادتوں کے بارے میں سب کچھ پڑھ لیا۔

"بتر ا!! اب تک سیکڑوں میل اڑ چکی ہو گی' ہے نا!" ننھی پریا نے کہا۔

"سیکڑوں نہیں ہزاروں!" بنٹی نے اُسے ٹوک کر ٹھیک کیا۔ "یہ پھر سے ہزاروں میل اڑ کر واپس اپنے گھر جائے گی۔"

آخر ان کے دوست پرندے کی رخصتی کا دن آ ہی گیا۔ منی کے پاپا سب بچوں اور بطخ کو لے کر

جھیل پر گئے۔ بچوں نے بطرا کو پیار سے منی کی گود میں سے اٹھایا اور آہستہ سے اُسے جھیل میں چھوڑ دیا۔ اُس نے تیرنا شروع کر دیا اور اپنی چونچ سے پانی میں کچھ کھودنے لگی بچے بہت دیر تک وہاں کھڑے اُسے دیکھتے رہے۔

اگلے دن منی بالکنی میں بچوں کو کھیلتے دیکھنے گئی۔ تو پارک میں کوئی نہیں تھا۔ اور پھر دروازے کی گھنٹی بجی اور بچوں کی فوج اندر آ گئی۔ "آنٹی" پلیز۔ منی کو ہمارے ساتھ پارک میں کھیلنے کے لئے بھیج دیجئے۔" انھوں نے کہا۔ "ہم اُسے وھیل چیئر پر حفاظت سے واپس لے آئیں گے۔" محبت بھرے بہت سے ننھے منے ہاتھوں کی مدد سے منی سیڑھیوں سے اُتری اور پارک میں لے جائی گئی۔

اُس کے بعد بھلا منی اکیلی اور اداس کیوں رہتی۔

کالندی

جس دن ہم اپنے نئے گھر میں رہنے آئے' کالندی نے ہمارا سواگت کیا۔ وہ سیڑھیوں پر تھی۔ دو آنکھیں ہمیں دیکھ رہی تھیں جن سے اپنائیت جھلک رہی تھی "کتنی خوبصورت کالی بلّی ہے!" میری چھوٹی بہن بینا نے کہا۔

میں تقریباً دوڑتی ہوئی گئی اور اُس نرم ملائم ننھے سے جانور کو اُٹھالیا "ہم اِسے کالندی پکاریں گے۔ یہ ہماری بلّی ہے 'ایک تحفہ ایک انعام' " میں نے سب کچھ جلدی جلدی کہہ دیا۔

کالندی نے یہ ثابت بھی کر دیا کہ وہ واقعی ایسی ہی ہے اور کچھ ہی دن میں وہ گھر بھر میں مشہور ہو گئی۔ اُس کے اپنے قاعدے قانون تھے اور ساتھ ہی اُسے لوگوں کے دل جیتنے کا گُر بھی آتا تھا۔ دوپہر میں جب میں اور بینا اسکول سے آتے کالندی گیٹ پر کھڑی ہوتی۔ اپنی کمر کی کمان بنائے۔ وہ اپنی کمر بہت اوپر اُٹھا لیتی تھی۔ بالوں بھرے چہرے اور اُن مسکراتی ہوئی ہری آنکھوں سے وہ ہمارا خیر مقدم کرتی۔ جب میری اماں ہمیں کھانا دیتیں تو کالندی اسٹول پر چڑھ کر ہمیں دیکھتی رہتی۔ وہ کبھی لالچ نہیں کرتی تھی۔ کبھی اُسے اپنا کھانا کھانے کی جلدی نہیں ہوتی تھی۔ مگر میری اماں جلدی سے کالندی کا دودھ اور چاول کا پیالا فرش پر رکھ دیتیں۔ وہ بڑی نزاکت اور شان سے اسٹول سے اُترتی' اماں کو اور ہم دونوں کو ایک نظر دیکھتی پھر اپنا منہ پیالے میں ڈال دیتی اور تب تک ڈالے رہتی جب تک چاٹ چاٹ کر وہ اُسے بالکل صاف نہ کر دیتی۔

"اماں وہ آپ کو شکریہ کہہ رہی ہے" بینا کہتی ہے اور میری اماں مسکرا دیتیں۔

"کالندی سب کچھ سمجھتی ہے" میں اکثر اپنی اماں سے کہتی۔ اصل میں مجھے یقین تھا کہ کالندی واقعی سب کچھ سمجھتی ہے۔ ورنہ وہ اُس وقت چپ چاپ کیسے بیٹھی رہتی تھی جب ہم لوگ اپنا ہوم ورک کرتے تھے۔ وہ اُس وقت 'میاؤں' کرتی نہ کھیلتی۔ مگر شام کو اور چھٹی کے دن جب ہم گھر

کے سامنے والے صحن میں ہوتے تو وہ ہمیں اِدھر اُدھر دوڑاتی' جھاڑیوں کے پیچھے چُھپ جاتی' گیند سے کھیلتی۔ اُس کی کالی گھنی دم اُوپر اُٹھی رہتی۔ کتنی کھلنڈری تھی وہ اُس کے ہونے سے کتنا مزا آتا تھا' آہستہ آہستہ ہمارے امّاں ابّا بھی اُس کا خیال رکھنے لگے اُس سے پیار کرنے لگے۔ ہمارے سب دوست بھی اُسے پسند کرتے تھے۔

شام کو جب میرے ابّا کام سے لوٹتے اور کالندی آس پاس نظر نہ آتی تو وہ پوچھتے'' کالندی کہاں ہے'' اور فوراً وہ اُن کے پیروں سے لپٹ جاتی' ریتا اور میں ہر وقت کالندی کا کوئی قصہ سنانے کے لیے تیار رہتے۔

کل کی بات ہے' میں گھر کے سامنے فٹ پاتھ پر کھڑی تھی اور بس سڑک پار کرنے ہی والی تھی کہ ایک دم کالندی نے میرے سامنے آکر مجھے روک لیا۔ وہ میری ٹانگوں میں لپٹ گئی۔ میں نے جھک کر اُسے دیکھا۔ اور اتنی سی دیر میں ہی ایک موٹر سائیکل بڑی تیزی سے گزر گئی۔ میں نے کالندی کو گود میں اُٹھالیا اور گھر میں دوڑ آئی امّاں کو بتانے کے لیے کہ کالندی نے مجھے کیسے بچایا۔

میری امّاں نے کہا'' سمیر کالندی کو سڑک پار کرتے ہوئے دیکھو۔ وہ فٹ پاتھ پر رُک کر پہلے سیدھی طرف پھر اُلٹی طرف دیکھتی ہے پھر سڑک پار کرتی ہے۔''

''اوہو' امّاں! ہماری کالندی کتنی سمجھدار ہے۔ سچ مچ کمال کی ہے۔''

میری بات مانیے وہ واقعی کمال کی تھی۔ ایک اتوار کی دوپہر' میری اور ریتا کی بحث ہو گئی۔ یہ پہلے جھگڑے' اور پھر لڑائی میں بدل گئی اُس نے میری ربر اور پینسل لے لی تھی۔ مجھے غصہ آگیا۔ میں نے اُس کا ہاتھ کس کر موڑا اور مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ بس اُسی وقت کالندی 'میاؤں' میاؤں' کرتی ہوئی مجھ پر کود دی۔ جب میں نے اپنا ہاتھ نیچے کر لیا تو وہ اُسے پیار سے چاٹنے لگی اور ریتا کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر دوڑ کر ریتا کی طرف گئی اور واپس بھاگ کر میری طرف آئی۔ میں سمجھ گئی کالندی کیا کہنا چاہتی ہے۔ اب میں اُس کی خاموش زبان سمجھنے لگی تھی' وہ کہنا چاہتی تھی کہ 'یہ تمہاری چھوٹی بہن ہے۔ تم اس سے پیار سے بات کیا کرو۔ ہماری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے میں نے کالندی کو اُٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ ریتا نے بھی اُسے لپٹا کر کہا۔ ''نہیں' نہیں' کالندی ہم کبھی نہیں لڑیں گے کم سے کم اس

طرح تو کبھی نہیں۔"

میں کبھی کبھی یہ بھی سوچتی تھی کہ ہم کالندی سے اتنا پیار کیوں کرتے ہیں؟اُس کی اپنی دنیا کیسی ہوگی 'بلّیوں کی دُنیا؟ مجھے اپنا جواب بھی مل جاتا۔ ہم کالندی سے اتنا پیار اس لیے کرتے ہیں کیونکہ وہ بھی ہم سے اتنا ہی پیار کرتی ہے۔

اُس کی دنیا ہماری دُنیا ہے 'اُس کی اور ہماری دُنیا ایک ہی ہے پیار امحبت کی دُنیا۔

پھر ہماری چھٹیاں شروع ہو گئیں۔ ہم لوگ بے تابی سے انتظار کرنے لگے کہ دادی ہمارے نئے گھر میں آکر ہمارے ساتھ رہیں گی۔ ہماری دادی بہت پیاری ہیں۔ اُنہیں بالکل ٹھیک ٹھیک پتہ رہتا ہے کہ ہم لوگوں کو کھانے میں کیا کیا پسند ہے۔ بہت کام کی خاتون ہیں اور کھانا بہت مزے کا پکاتی ہیں۔ رات کو وہ ہمیں اُس وقت تک کہانیاں سناتیں جب تک ہم سو نہیں جاتے۔ اُن کا ہمارے یہاں آنا ہمارے لیے جشن سا ہوتا تھا۔ وہ محبت تو بہت کرتی تھیں مگر سخت بھی بہت تھیں۔

تو پھر دادی بہت سے کھلونے کتابیں' اور مٹھائیاں لے کر آگئیں۔ "آہا' شکریہ' شکریہ دادی' ہمارے پاس بھی آپ کے لیے ایک تحفہ ہے۔" میں دوڑی دوڑی پچھلے صحن میں گئی اور کالندی کو گود میں اُٹھا کر دادی کے پاس آگئی۔ دادی نے اُسے دیکھا۔ "یہ ہماری کالندی ہے' ہماری دوست' ہے ناخوبصورت؟ ہے نا پیاری پیاری؟" میں نے کہا۔

دادی کچھ فکرمند سی ہو گئیں اور ہمیں گھورتے ہوئے بولیں۔ "کالی بلّی!"

میرا دل ڈوبنے لگا! کیا دادی کو کالندی پسند نہیں آئی؟ بیتا نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا۔ اُس نے اور میں نے جلدی جلدی خوب بڑھا چڑھا کر اُنہیں بتایا کہ کالندی کتنی کمال کی چیز ہے' وہ ہم سے کتنا پیار کرتی ہے۔ اور ہم بھی اُس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ مگر ہماری باتوں کا دادی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کالندی نے ہلکے سے میاؤں کی۔ "یہ آپ کو نمستے کر رہی ہے دادی! آپ کا سواگت کر رہی ہے۔" "یہ آپ کو بھی پیار کرتی ہے! اُس کی زبان یہی ہے۔"

دادی اب بھی خاموش تھیں' اُن کی آنکھوں میں ایک سوال تھا۔ اُنہوں نے پوچھا۔ "کیا یہ بلّی اسی گھر کی ہے؟"

"ارے 'دادی یہ گھر اسی کا ہے 'جب ہم یہاں آئے تھے تو یہ پہلے سے یہاں تھی۔ ہم سب بھی اسی کے ہیں۔" میں نے کہا۔

دادی نے غصّے سے گھورا اور کہا۔ "صبح صبح کالی بلی کو دیکھنا اچھا نہیں ہوتا ہے۔"

میں بہت زیادہ پریشان ہو گی۔ میں نے کالندی کو اُٹھایا اور پچھلے صحن کی طرف دوڑ گئی۔ بیتا میرے پیچھے پیچھے آئی۔ ہم دونوں آم کے بڑے پیڑ کے نیچے بیٹھ گئے 'کالندی کو گود میں دبوچ لیا اور کہا' "دادی بہت اچھی ہیں' کالندی اُن کی بات کا وہ مطلب نہیں تھا۔ پلیز' پلیز تم ہی اُنہیں سکھاؤ کہ وہ تم سے پیار کرنے لگیں۔"

چھٹیوں کے دن شروع ہو گئے۔ چمکتی دھوپ بھرے خوشگوار دن' مگر میرے اور بیتا کے لیے دھوپ کی ساری چمک جیسے غائب ہو گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم ایک بادل کے نیچے آ گئے ہوں۔ ہم طرح طرح کے منصوبے بناتے رہتے' بہت اچھی طرح رہتے' اچھی اچھی باتیں کرتے' تاکہ کسی طرح دادی کو خوش کر سکیں۔ ہمارا مقصد بس ایک ہی تھا کہ کسی طرح وہ کالندی کو قبول کر لیں' اُسے اپنا لیں۔ ہمارے اماں ابا کو بھی اندازہ تھا کہ دادی کالندی کو پسند نہیں کرتیں۔

بیچاری کالندی! اُس کی سمجھ میں بھی آ گیا تھا۔ جب دادی نے کالندی کا اسٹول' اُس کا بستر اور پیالہ پیچھے برآمدے کے ایک الگ تھلگ کونے میں رکھ دیئے تو کسی نے کوئی شکایت نہیں کی' کسی نے اُن کی بات ماننے سے انکار نہیں کیا۔ جب بھی دادی اپنی آواز اونچی کرتیں کالندی اپنے کونے میں واپس دُبک جاتی۔ جب ہم دادی کے ساتھ بیٹھ کر اُن سے کہانیاں سنتے کالندی آس پاس کہیں نظر نہ آتی۔ جب ہم گھر کے سامنے کے صحن میں کھیلتے تو اُسے بُلا لیتے" "آؤ کالندی' دادی مندر گئی ہیں" وہ ہمارے کھیل میں شامل ہو جاتی مگر جیسے ہی اُسے دادی کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی وہ واپس بھاگ جاتی۔ ایسی تھی ہماری کالندی! وہ اپنے بس بھر پوری کوشش کرتی کہ دادی کو کوئی تکلیف نہ پہنچائے۔

نہانے کے بعد دادی پوجا کے کمرے میں بیٹھتی تھیں۔ اندر جانے سے پہلے وہ کڑک دار آواز میں کہتیں۔ "بہو' دھیان رکھنا کالندی یہاں اندر نہ آ جائے۔ اُسے گھر سے نکال دو" مگر کالندی تو پہلے ہی گھر سے باہر چلی جاتی تھی۔

"وہ آپ کی کتنی عزت کرتی ہے' دادی' وہ کسی بھی طرح آپ کو پریشان نہیں کرتی۔" پتا کہتی۔
"دادی' وہ تو اپنے بچھڑے کیسر جیسی ہے" میں ٹکڑا لگاتی۔ ہمارے وطن میں دادی کے گھر پر گائے اور بچھڑے پلے ہوئے تھے۔ کیسر دادی کا عزیز ترین بچھڑا تھا۔ اور ■ بھی کالا تھا۔

دادی نہیں مانیں۔ اپنی مالا ہاتھ میں لے کر اُنہوں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ ہم دادی کو پیار کرتے تھے۔ وہ ہمارا کتنا خیال رکھتی تھیں۔ اُنہوں نے ہمیں کتنی بہت سی کہانیاں سنائیں کہ کالی بلّی کیسی خراب ہوتی ہے۔ مگر کالندی تو اچھی تھی۔ صرف اچھی نہیں وہ تو کمال کی تھی۔ ہمارے لیے تو وہ بہت ہی خاص چیز تھی۔ ہم اُس سے پیار کرتے تھے۔ اُس نے کبھی حالات کی اس نئی تبدیلی کی شکایت نہیں کی۔ وہ اب بھی اپنی پُر سکون' ہری ہری آنکھوں سے ہمیں پیار سے دیکھتی۔ اُس کی آنکھوں سے کبھی اُس کے اندر کے احساسات کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر کالندی' ہمیں سب معلوم ہے۔

دادی کالندی سے کٹی کٹی رہتیں۔ خاص طور پر صبح سویرے کیونکہ دادی صبح بہت سویرے اُٹھ جاتی تھیں اس لیے کالندی کو رات بھر کے لیے پچھلے صحن میں کوئلے رکھنے کے لیے ادھ بنے کمرے میں دھکیل کر بند کر دیا جاتا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ دادی کو کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ اُنہیں معلوم تھا کہ ہم کالندی سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ "میں اس کالی بلّی کو سویرے پوجا سے پہلے نہیں دیکھنا چاہتی۔" اس لیے وہ ہر طرح کی احتیاط سے کام لیتیں۔ ہم نے اپنے امّاں ابّا سے سُنا کہ جب ■ سویرے اُٹھتیں' تو ہتھیلیوں سے آنکھیں بند کیے ہلکے ہلکے چلتی ہوئی باتھ روم جاتیں اور لوٹ کر پوجا کے کمرے میں جاتیں اور مورتی کے سامنے ماتھا ٹیکنے کے بعد ہی اپنی آنکھیں کھولتی تھیں۔

پھر میری سالگرہ آگئی۔ دادی بہت خوش تھیں۔ اتفاق سے ہندو کیلنڈر کے حساب سے ■ نئے سال کا دن بھی تھا۔ ایک دن پہلے اُنہوں نے بہت زور دار تیاریاں کیں۔ مٹھائیاں بنائیں۔ رنگ برنگے پھول بھی تیار تھے۔ دادی نے چنبیلی کی کلیوں کے خوبصورت ہار بنائے۔

شام کو دادی نے مجھے آواز دی۔ "میری پیاری بیٹی کو تحفے میں کیا چاہیے؟" میں اُن کی طرف دیکھتی رہ گئی منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ مجھے اور بیتا دونوں کو آنے والے دن کی کوئی خوشی کوئی جوش نہیں تھا۔ ہم دونوں اُداس تھے۔ ہمارے سب دوست آئیں گے۔ کیا کالندی کو بھی ہمارے ساتھ آنے کی اجازت ملے گی؟

میں نے بس اِتنا کہا۔ "کوئی خاص چیز نہیں" اور اپنے آپ کو اُن سے الگ کر لیا۔

رات کو ہمارے سونے سے پہلے دادی خاص طور پر میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں "میں صبح سویرے تمہیں جگاؤں گی اور ہم سب مل کر نئے سال کی پوجا کریں گے۔"

اگلی صبح دادی نے مجھے جگایا۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا! سامنے، دروازے میں، دادی کھڑی تھیں اور اُن کی گود میں کالندی تھی!

میں نے اپنی آنکھیں ملیں اور چلا کر بیتا، اماں اور ابا کو بلایا۔ یہ تو خواب تھا۔ دادی بڑے پیار سے کالندی پر ہاتھ پھیر رہی تھیں! میں اپنے آنسو نہیں چھپانا چاہتی تھی۔ میں دادی سے لپٹ گئی اور پوچھا۔ "یہ سب کیا ہے دادی؟" "کچھ نہیں، کچھ نہیں، میں تمھیں بعد میں بتاؤں گی۔ یا پھر تمہاری اماں بتادیں گی تمھیں۔ تم خوش تو ہو میری پیاری پیاری بٹی؟" انہوں نے پوچھا۔

آپ کو پتا ہے یہ سب کیسے ہوا؟ میری اماں نے مجھے بتایا۔ میری سالگرہ سے پہلے والی رات کو تیز بارش ہوئی۔ جب نانی نے دیکھ لیا کہ کالندی کو گھر سے باہر نکال کر تالا لگادیا گیا ہے۔ تو وہ سونے کے لیے لیٹ گئیں۔ بارش شروع ہو گئی تھی۔ انہیں اپنے پھول اور چنبیلی کے ہار یاد آئے تو وہ اُٹھیں۔ کلیوں اور پھولوں کو تازہ ہوا ملنا تو ضروری ہے۔ وہ پوجا کے کمرے میں گئیں، روشن دان کھولا اور واپس آکر لیٹ گئیں۔

صبح اپنی روزانہ کی احتیاط کے ساتھ اُنہوں نے دن کی شروعات کی۔ ہتھیلیوں سے آنکھیں بند کیے کیے وہ پوجا کے کمرے میں گئیں۔ مورتی کے سامنے ماتھا ٹیکا اور آنکھیں کھولیں۔ اے لو۔ کیا دیکھتی ہیں مورتی کے بالکل سامنے کالندی لیٹی آنکھیں بند کیسے چپ چاپ اونگھ رہی ہے۔ اُس نے کسی چیز کو نہیں چھیڑا تھا۔ وہاں رکھی مٹھائیوں کو چھوا تک نہیں تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ میری دادی نے اندھیرے میں کالندی کے سامنے ماتھا ٹیک لیا تھا۔ نئے سال کی پہلی پہلی صبح کو۔

دادی ذرا دیر رُکیں۔ سامنے شان سے بیٹھی ہوئی کالندی کو دیکھا پھر اُسے اُٹھا کر میری اماں کو پکارا۔ "بہو" انہوں نے کہا "کالندی میرا تحفہ ہے سمیر کی سالگرہ کا۔" ■ بارش کی وجہ سے اندر آگئی تھی۔
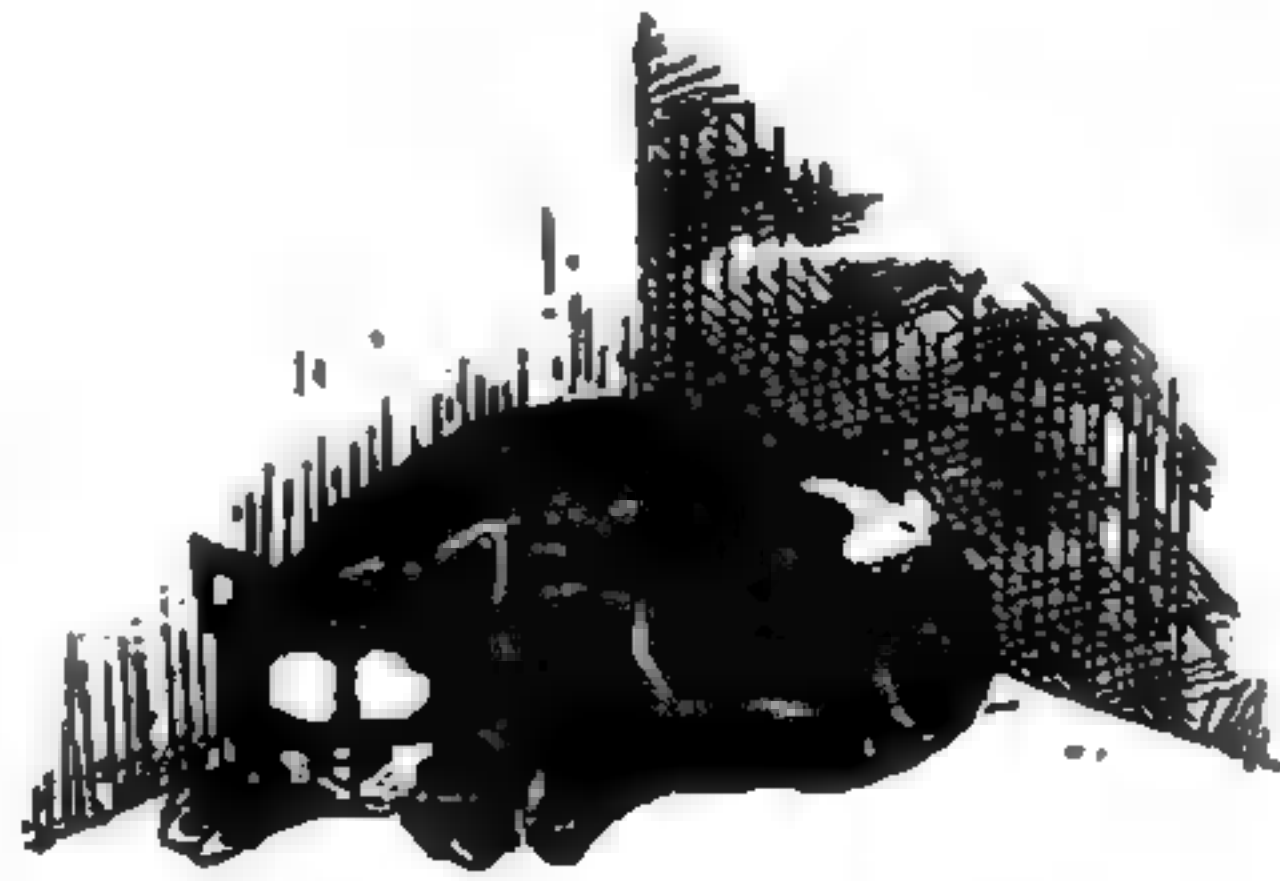
مرتے دم تک

نیلم خوشی میں دوڑتی چلاتی گھر میں گھسی" بھائی علی آ گئے' بھائی علی آ گئے۔"

رام سنگھ کے خاندان کے سبھی لوگ دوڑتے ہوئے باہر نکلے! سامنے وہ کھڑے تھے' لمبے قد کے آدمی' چوڑے چوڑے کندھے' لال لال گال اور ناک اور گیہواں رنگ۔ ایک موٹا اور لمبا سا گرم کوٹ' کسی ہوئی پینٹ' بڑے بڑے چمڑے کے جوتے اور کنٹھئی فر کی ٹوپی پہنے تھے۔

رام سنگھ نے اُنہیں سینے سے لگالیا اور کہا۔ "اندر آیئے! اندر آیئے! آپ کا سواگت ہے۔"

بھائی علی نے سب لوگوں کو پیار سے تھپتھپایا اور خاندان کے ایک ایک فرد سے اپنی بھاری کڑک دار آواز میں محبت سے بات کی اور آرام سے پلنگ پر بیٹھ گئے۔

نیلم اور ارجن اُن کے جوتوں کے فیتے کھولنے میں مصروف ہو گئے۔ اماں نے چائے بنائی اور لابھائی علی سے باتیں کرنے لگے۔

"میں یہاں بس ایک رات رُکوں گا۔ کل صبح سیاٹو' چلا جاؤں گا۔" بھائی علی نے کہا۔

"نہیں بھائی علی' نہیں! ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے۔ آپ کو ہمیں اپنی پہاڑوں کی کہانیاں سنانی پڑیں گی۔"

بہت کہنے سننے پر وہ دو دن رُکنے کے لیے تیار ہو گئے۔

بھائی علی کا کام ہی سفر کرنا تھا۔ وہ ہمالیہ کی پہاڑیوں میں دور دور تک پیدل سفر کرتے۔ اُنہیں قدرتی مناظر دیکھنے کا شوق تھا۔ وہ پہاڑوں میں گاؤں گاؤں' شہر شہر گھومتے اور سوکھی خوبانیاں' جڑی بوٹیاں' دوائیں اور قیمتی پتھر بیچتے تھے۔ جنہیں وہ گھوم گھوم کر جمع کرتے تھے۔ وہ اپنے انوکھے تجربات کی کہانیاں بھی سناتے تھے۔

"اب کی بار آپ کہاں رہے" رام سنگھ نے پوچھا

"میں اونچے پہاڑوں کی طرف گیا تھا' ہندوستان کی سرحد تک 'تبت گیا تھا۔"

"اکیلے؟" نیلم نے کہا۔

"بالکل! مجھے تو اُس کی عادت ہے۔"

اُس رات سب لوگ دیر رات تک جاگتے رہے اور اُن کے پلنگ پر بیٹھے برف کے تینددے کی دلچسپ کہانی سنتے رہے۔

"سب سے نزدیک کا گاؤں لگ بھگ دو گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ انہوں نے کہا: "میں تبت اور ہندوستان کی سرحد سے دو چار میل کی دوری پر تھا۔ مجھے بہت بھوک لگی تھی اور میں چیڑ کے ایک بڑے پیڑ کے نیچے بیٹھا تھا۔ میں نے پیڑ کے موٹے تنے سے اپنی پیٹھ ٹکائی تھی اور مزے سے کھانا کھانا شروع کیا' جو میرے ایک دوست نے میرے لیے ساتھ باندھ دیا تھا۔

"میں نے ابھی دو چار نوالے ہی کھائے تھے کہ مجھے کچھ ہلکی کمزور سی غراہٹ سنائی دی۔ میں ڈر گیا۔ میرے خیال میں یہ بھالو ہے' میں نے اپنے آپ سے کہا۔ دور سے آتی ہلکی سی غراہٹ کا مطلب تھا کہ وہ ابھی کافی دور تھا۔ میں نے جھٹ پٹ اپنا ناشتے دان بند کیا اور نیچے جُھک کر بیٹھ گیا تاکہ تیز ہوا میری اور میرے کھانے کی خوشبو جنگلی جانور تک نہ پہنچادے۔ میں نے اپنی لمبی بانس کی لاٹھی' جس کے سرے پر نوکیلا لوہا لگا تھا' اپنے سیدھے ہاتھ میں پکڑی اور ایک بڑا سا دودھاری چاقو اُلٹے ہاتھ میں لے لیا۔

"احتیاط سے گھٹنوں کے بل چلتا ہوا میں پہاڑی کے کنارے تک گیا اور نیچے گہرائی میں پتلی سی گھاٹی میں جھانکا۔ جلدی ہی مجھے سامنے والے پہاڑ کی ڈھلان پر 'ایک سپاٹ زمین کے حصے پر تینددے کے دو چھوٹے چھوٹے بچے نظر آگئے۔"

"وہ کیسے لگ رہے تھے؟" نیلم نے پوچھا۔

"یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کتنے خوبصورت تھے۔ میں زندگی میں پہلی بار انہیں دیکھ رہا تھا۔ اُن کے ملائم' برف کی طرح سفید روئیں دار کوٹ بالکل برف کا ہی حصہ لگ رہے تھے۔ اُن کی ہری ہری چمکتی آنکھیں جیسے چھوٹے چھوٹے دیئے جل رہے ہوں۔"

"وہ تینڈوے کے بچے کیا کر رہے تھے؟" ارجن نے پوچھا۔

"وہ کھیل رہے تھے۔ اپنی تھوتھنی برف سے لگا کر وہ ایک دوسرے سے کچھ فاصلے سے جھک جاتے۔ کچھ دور گھسٹتے چلے جاتے' اور پھر دونوں ایک دوسرے کو اپنی پیاری پیاری ہری آنکھیں گول گول گھما کر دیکھتے۔ پھر اُن میں سے ایک دوسرے کے اوپر کودتا۔ تھوڑی دیر دونوں دھینگا مشتی کرتے اور ہلکے ہلکے غُراتے۔ پھر دوبارہ جھکتے اور دوبارہ کشتی لڑنے لگتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ دونوں اپنے شکار کے سبق کی مشق کر رہے ہوں' جو اُن کی ماں نے اُنہیں دیا تھا۔ ویسے تو انہیں دیکھنے میں مجھے بڑا مزا آرہا تھا مگر میں پریشان تھا۔"

"کیوں؟" ارجن کے لبّا نے پوچھا

"میں اس لیے پریشان تھا کہ مادہ تینڈوا کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے پہاڑی لوگوں سے سنا تھا کہ مادہ تینڈوا بہت ہی خطرناک ہو جاتی ہے جب اُس کے چھوٹے بچے ہوتے ہیں۔ اُن برفیلے پہاڑوں پر کھانے کی بہت کمی تھی اور جنگلی بلّیاں' بھیڑیے اور بھالو ہر وقت شکار کی تلاش میں رہتے تھے۔ اُس لیے مادہ تینڈوا اپنے بچوں کو غاروں اور بڑے بڑے سُراخوں میں اُس وقت تک چھپا کر رکھتی تھی جب تک وہ اتنے بڑے نہ ہو جائیں کہ خود لڑ کر اپنی حفاظت کر سکیں۔"

"پھر کیا ہوا۔" نیلم نے بے چینی سے پوچھا

"میں ویسے ہی پیٹ کے بل زمین سے چپکا رہا۔ میں بہت چوکنا تھا' چاروں طرف نظر دوڑا رہا تھا کہ کہیں مادہ تینڈوا آس پاس نہ ہو۔

"تھوڑی دیر بعد مجھے ایک حیرت ناک منظر نظر آیا! ایک بھاری بھرکم کالا بھالو بنا پتیوں والے پیڑوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے سے نکلا' اور آہستہ آہستہ تینڈوے کے بچوں کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر حیرت اور خوف کے مارے میری بُری حالت ہو گئی جب ایک بہت بڑی سفید بلی' یعنی مادہ تینڈوا' مجھے اپنی ہی پہاڑی پر نظر آئی۔"

"ہے بھگوان" ارجن چلایا۔

"کیا ڈراؤنا منظر ہو گا۔!" نیلم نے بھی کہا۔

"چپ رہو!" اُن کی اماں نے بے صبری سے کہا۔ "آگے کیا ہوا!؟"

"خدا کا شکر ہے وہ نیچے ڈھلان پر مجھ سے کچھ دور تھی۔ میری قسمت اچھی تھی کیونکہ اُس کی آنکھیں صرف اپنے بچوں پر لگی ہوئی تھیں اور وہ اوپر نہیں دیکھ رہی تھی۔

"دونوں پہاڑیوں کے بیچ ایک پتلی سی گہری کھائی تھی۔ پلک جھپکتے ہی مادہ تیندوے نے ہوا میں جست لگائی اور سیدھی بھالو کی کمر پر جا کودی۔ اُس نے بھالو کو کس کر جکڑ لیا اور زور زور سے جھٹکے دینے لگی۔

"بھالو اس اچانک حملے سے گھبرا کر لڑکھڑا گیا۔ دونوں خونخوار جانور ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے برفیلی ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے نیچے وادی میں جا کر گرے۔ بڑی زوردار 'دھپ' کی آواز گونجی۔ میں نے اور تیندوے کے دونوں ڈرے سہمے بچوں نے گردن اُٹھا کر دیکھا۔

"بھالو اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ اور اپنے بڑے بڑے مضبوط پنجے پھیلا لیے جن میں نوکیلے ناخن نکلے ہوئے تھے۔ اُس نے اپنے دانت نکالے اور غرّانے لگا۔ وہ آخری دم تک لڑنے کے لیے تیار تھا۔

"مادہ تیندوے نے ایک پل کے لیے اُسے دیکھا' دانت نکال کر غرّائی اور ایک چھلانگ میں کالے وحشی بھالو کو دبوچ لیا۔

"ساری وادی اُن کی لڑائی کی آوازوں سے گونج اُٹھی۔ تیندوے کے بچے بھی زور زور سے غرّانے لگے' وہ اپنی ماں کے لیے رو رہے تھے۔ اُف اُن کی جنگ کتنی خوفناک تھی۔ برف کا تیندوا غضب کا پھرتیلا تھا اور دائیں بائیں چھلانگیں لگا کر بھالو کی بالوں بھری کالی کھال کے بڑے بڑے ٹکڑے نوچ رہا تھا۔ بھالو بھاری بھرکم ہونے کی وجہ سے سُست تھا وہ مشکل سے ہی کبھی کبھی تیندوے کو زخمی کر پاتا تھا۔

"لڑائی لگ بھگ دس منٹ تک جاری رہی۔ بھالو کے بُری طرح خون بہہ رہا تھا۔ جب بھی تیندوا حملہ کرتا بھالو اپنے بڑے بڑے پنجے اُٹھا کر اپنا منہ چھپا لیتا اور اپنا جسم حملے کے لیے آگے کر دیتا۔

"دونوں لڑتے لڑتے آگے بڑھتے چلے گئے اور بڑے پہاڑ کی اوٹ میں غائب ہو گئے۔ تھوڑی

دیر تک تو میں اُنہیں دیکھ بھی نہیں سکا مگر مجھے اُن کی غراہٹیں اور چیخیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"اور ایک بار پھر چاروں طرف خاموشی چھاگئی۔ مادہ تیندوا ایک بار پھر دکھائی دی وہ بھاگ کر اپنے بچوں کے پاس گئی۔ وہ بچوں کو بار بار سونگھ رہی تھی شاید یہ یقین کرنا چاہتی تھی کہ بھالو نے اُنہیں زخمی تو نہیں کیا۔ پھر اُس نے بچوں کو چاٹنا شروع کیا اور وہ تینوں پہاڑ پر چڑھ کر غائب ہو گئے۔"

"آپ کو تو بہت سکون ہوا ہو گا!" نیلم نے کہا۔

"ہاں سچ سچ' میں کچھ دیر اور اُسی حالت میں رہا تاکہ یقین کرلوں کے تینددوں کا خاندان وہاں سے واقعی چلا گیا ہے۔ جب میں اُٹھا تو میرے گھٹنے اکڑ گئے تھے۔ روشنی کم ہو رہی تھی کیونکہ اُس طرف سورج جلدی چھپ جاتا ہے۔ مجھے ابھی بہت دور جانا تھا۔ اکڑی ٹانگوں' ڈر' اور پھسلواں برف کے باوجود میں نے اپنے بس بھر تیز چلنے کی کوشش کی۔ چلنے سے پہلے میں خدا کا شکر ادا کرنا نہیں بھولا تھا۔"

"کیوں' اس لیے کہ مادہ تیندوے نے آپ کو چھوڑ دیا تھا؟"

بھائی علی نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"بھالو کا کیا ہوا؟" ارجن نے پوچھا۔

"وہ شاید مر گیا یا بھاگ گیا تھا۔ مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ اُس وقت بھالو کا آنا میرے لیے رحمت بن گیا تھا۔ کیونکہ اُس کی وجہ سے مادہ تیندوا مجھے نہیں دیکھ پائی۔ میں نے خدا کا شکر صرف اس لیے ادا نہیں کیا کہ میں بچ گیا تھا بلکہ اس لیے کہ جو کچھ میں نے سنا تھا۔ سچ نکلا تھا۔ برف کے تیندوے میں مامتا کا جذبہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اپنے بچوں کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ وہ مرتے دم تک لڑنے کے لیے تیار تھی۔"

منہ بولی ماں

"بدھمی، پیاری بیٹی، تم کہاں ہو؟ دیکھو میں تمھارے لئے کیا لائی ہوں۔" مسز جیمس نے کہا۔

"لو وہ آگئیں بدھمی کی منہ بولی ماں ایک اور آسمانی تحفے کے ساتھ۔" بدھمی کے بھائی سُنیل نے چڑاتے ہوئے کہا۔

"کچھ لوگوں کی قسمت ہی ایسی ہوتی ہے۔ مسز جیمس جیسی منہ بولی ماں میری کیوں نہیں ہیں۔" بدھمی کی بہن پوجا شکایتی انداز میں بڑبڑائی۔

"کیونکہ تم گھر بھر کی لاڈلی نہیں ہو۔" سُنیل نے چھیڑا اور پوجا کو آنکھ ماری۔

"اف! نہیں پھر سے۔" بدھمی جھنجھلا کر بڑبڑائی۔ وہ بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی اور سُنیل سب سے بڑا۔ وہ چودہ سال کا تھا، پوجا تیرہ سال کی اور بدھمی دس سال کی۔ گھر بھر کی لاڈلی۔

سُنیل اور پوجا اکثر بدھمی کو چھیڑتے تھے کیونکہ ان کے امّاں ابّا ابھی تک اُسے بچّی سمجھتے تھے۔ بدھمی یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھی اور پوری کوشش کرتی تھی کہ بڑوں کی طرح رہے۔

تینوں بچے اُس چھوٹے سے پہاڑی شہر میں اپنی ماں، مسز شرما کے ساتھ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے آئے تھے۔ مسز جیمس ان کی مکان مالکن تھیں اور اُسی مکان کی پہلی منزل پر رہتی تھیں۔

جس دن وہ لوگ وہاں پہنچے اُسی دن سے بدھمی مسز جیمس کی چہیتی بن گئی تھی۔ وہ بہت محبت کرنے والی خاتون تھیں اور ان سب سے ہی محبت کرتی تھیں مگر بدھمی کے لیے ان کے دل میں ایک خاص جگہ تھی۔ وہ اُس پر محبت کی بارش کرتی رہتیں اور اکثر اُسے طرح طرح کے تحفے بھی دیتیں۔

شروع شروع میں بدھمی کو اُس سب جھمیلے میں مزا آتا تھا مگر آہستہ آہستہ جب سُنیل اور پوجا نے اُس کا مذاق اڑانا شروع کیا اور مسز جیمس کو اُس کی منہ بولی کہانے لگے تو وہ چڑنے لگی۔

"آخر میں ہی کیوں؟" وہ شکایت کرتی۔

"آہا'مسز جیمس۔ آیئے آیئے' اندر آیئے' بِندھی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔اُس کے پیٹ میں درد ہے لیٹی ہوئی ہے۔" مسز شرما نے اپنے مہمان کو خوش آمدید کہا۔

"پیٹ میں درد؟ یہ تو بہت بُری بات ہو گئی۔ میں نے تو یہ چاکلیٹ کیک بنایا تھا اُس کے لیے۔ مجھے معلوم ہے اُسے یہ اچھا لگتا ہے۔ چلو کوئی بات نہیں' میرے پاس پیٹ کے درد کا ایک لاجواب علاج ہے۔ درد پل بھر میں غائب ہو جائے گا۔ میں لاتی ہوں ابھی" مسز جیمس چلی گئیں۔ جب وہ واپس آئیں تو کہنے لگیں۔ "اور ہاں اُس کے کھانے کے لیے پریشان مت ہونا میں اُس کے لیے سوپ لے آؤں گی۔"

بِندھی جل کر رہ گئی۔ اُس نے کنکھیوں سے اپنے بھائی بہن کی طرف دیکھا۔ وہ لوگ شرارت سے مسکرا رہے تھے۔ اُسی وقت اُس کی اماں کیک لیے اندر آئیں۔

"اُف! اماں! آخر یہ مسز جیمس میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ تیں؟ میں تنگ آ گئی ہوں اُن کے اس جھمیلے سے۔ وہ تو مجھے چوزا سمجھ کر مرغی کی طرح میرے پیچھے پیچھے پھرتی ہیں۔ میں ننھی منی بچی نہیں ہوں۔" بِندھی غصّے سے پھٹ پڑی۔

"بِندھی' ایسی باتیں نہیں کرتے' تم کو نہیں معلوم وہ کتنی اکیلی ہیں۔ ان کا کوئی نہیں اگر وہ تمھارے ساتھ تھوڑا سا وقت گزارنا چاہتی ہیں تو تمھیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اور پھر وہ تم سے اتنا پیار کرتی ہیں۔" اُس کی اماں نے سمجھایا۔ بِندھی ایک لفظ بھی نہیں بولی چپ چاپ منہ پھلائے بیٹھی رہی۔

ایک دن بِندھی باغ میں کھیل رہی تھیں اُس کی اماں بازار گئی تھیں' سُنیل اور پوجا اندر گھر میں تھے۔

"آہا' بِندھی بیٹی' تمھیں کھیلتے ہوئے دیکھ کر بڑا اچھا لگ رہا ہے۔ اُس کا مطلب ہے اب تم بالکل ٹھیک ہو۔" بِندھی نے نظر اٹھا کر دیکھا تو مسز جیمس باغ کے چھوٹے گیٹ پر کھڑی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں بازار سے خریدی ہوئی چیزوں کا تھیلا تھا۔

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں' آنٹی۔" بِندھی نے شرافت سے جواب دیا۔

"لو چاکلیٹ کھاؤ" مسز جیمس نے ایک چھوٹی سی چاکلیٹ اُس کی طرف بڑھائی۔ چاکلیٹ بِندھی کی کمزوری تھی۔ وہ چاکلیٹ لینے کے لیے ہاتھ بڑھانے والی ہی تھی کہ اُسے سُنیل کی آواز سنائی دی۔

اُس نے کہا "شکریہ آنٹی' مگر میں نے چاکلیٹ کھانی چھوڑ دی ہے۔ اماں کہتی ہیں یہ پیٹ

کے لیے خراب ہوتی ہیں۔

مسز جیمس چاکلیٹ واپس تھیلے میں رکھ لی اور تھوڑی دیر گہری سوچ میں ڈوبی چپ چاپ کھڑی رہیں۔

پدمی کو بے چینی ہو رہی تھی۔ اُس نے چپکے سے گھر کی طرف نظر ڈالی۔ اُسے ڈر تھا کہ سُنیل اور پوجا کسی بھی وقت باہر آسکتے ہیں۔

اچانک مسز جیمس نے کہا "کل دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھانا۔ میں تمھاری اماں سے کہہ دوں گی کہ تمھیں بھیج دیں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے وہاں سے چلی گئیں۔

"آخر میں ہی کیوں؟" پدمی غصّے سے بڑبڑائی۔ 'بھیا اور دیدی بھی تو ہیں۔ اب انھیں ایک اور موقع مل جائے گا میرا مذاق اڑانے کا۔' جھنجھلاہٹ سے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

'میں نہیں جاؤں گی۔ دیکھتی ہوں مجھے کون بھیجے گا۔ ماں بھی نہیں۔ میں بہانہ کر دوں گی کہ میرے پیٹ میں درد ہے' پدمی نے منصوبہ بنایا مگر رات کو حالات نے ایسا موڑ لیا کہ پدمی کو پیٹ کے درد کا جھوٹا بہانا بنانے کے بجائے زیادہ بہتر بہانہ مل گیا۔

رات کے کھانے کے وقت اُسے پتہ چلا کہ سُنیل اور پوجا اپنے دوستوں کے ساتھ پکنک پر "لال ٹبا" جا رہے ہیں۔ فوراً اُسے خیال آیا اور اُس نے کہا۔ "میں بھی پکنک پر جاؤں گی۔"

"اوہو۔ نہیں نہیں۔" سُنیل اور پوجا نے کہا۔

"تمھیں پتہ ہے 'لال ٹبا' یہاں سے کتنی دور ہے؟ اور سارے راستے کتنی سیدھی چڑھائی ہے۔ ہم لوگ پیدل جا رہے ہیں 'ٹٹوؤں پر نہیں جا رہے۔" سُنیل نے اُسے سمجھا بجھا کر ٹالنے کی کوشش کی۔

"ہاں ہاں مجھے معلوم ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ پکنک کے لیے بہت ہی خوبصورت جگہ ہے۔ وہاں سے ہمالیہ کی ساری برفیلی چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ میں پیدل جانے کے لیے تیار ہوں۔" پدمی نے اٹل جواب دیا۔

"ذرا سی دیر میں تم تھک جاؤ گی۔" سُنیل نے پھر کوشش کی۔

"تمھیں ہمالیہ کی برفیلی چوٹیوں کا شوق کب سے ہو گیا؟" پوجا نے پوچھا۔

"ابھی اِسی وقت اور میں تھکوں گی نہیں۔" بِدھی نے جیسے آخری فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔
"اب اِتنا کہہ رہی ہے تو لے جاؤنہ ساتھ۔ آخر تمھاری چھوٹی بہن ہے۔ اسے بھی پکنک میں مزا آئے گا۔" مسز شرما نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" سُنیل اور پوجا بے دلی سے تیار ہو گئے۔ "مگر تم ٹھیک وقت پر تیار رہنا۔" اُنھوں نے بِدھی کو ہڑکایا۔

بِدھی خوش تھی۔ اب اُسے مسز جیمس کے گھر کھانے پر نہیں جانا پڑے گا۔ یہ تو اچھا ہے کہ ابھی تک اماں کو اس بارے میں کچھ پتہ نہیں اُس نے سوچا۔

اگلی صبح بِدھی سب سے پہلے اٹھ کر تیار ہو گئی۔ ۶ بجے وہ لوگ لال ٹبا کے لیے نکلے اور دس بجے تک وہاں پہنچ گئے۔

دن بہت سُہانا تھا۔ آسمان صاف تھا اور وہ برف سے ڈھکی چوٹیاں دیکھ سکتے تھے۔ اُنھوں نے بہت سے کھیل کھیلے، اور مزے دار کھانا کھایا۔ سُنیل اور پوجا نے بِدھی کا بہت خیال رکھا۔ اُنھوں نے اُسے بالکل نہیں چھیڑا۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود پتہ نہیں کیوں بِدھی کو پکنک میں مزا نہیں آیا۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے اُس نے کوئی غلط کام کیا ہے۔

جب وہ گھر پہنچے تو سات بج چکے تھے۔ کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔

"پکنک کیسی رہی؟" اماں نے پوچھا۔ "ارے بِدھی مسز جیمس سارے دن تمھیں ڈھونڈتی رہیں۔" اُنھوں نے بِدھی کو دیکھ کر کہا۔

"کیوں؟" بِدھی نے پوچھا۔ کیا مسز جیمس نے اماں کو بتا دیا؟

"مجھے نہیں معلوم، مگر وہ کئی بار آئیں تھیں تم جا کر خود کیوں نہیں پوچھ لیتیں؟"

بِدھی کو بے چینی سی ہوئی۔ اُس نے سُنیل اور پوجا کی طرف دیکھا۔ وہ لوگ مسکرا رہے تھے۔ سُنیل نے آہستہ سے کہا۔ "منہ بولی اماں" بِدھی جلدی سے باہر نکل گئی اور بے دلی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

پہلی منزل پر روشنی نہیں تھی، بِدھی نے ہلکے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی جواب نہیں ملا۔

جب اُس نے دروازے کو دھکا دیا تو وہ کھل گیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اُس نے روشنی جلائی۔

"کون ہے؟" اُسے اندر گھر میں کہیں سے مسز جیمس کی آواز سنائی دی۔

"میں بدھی ہوں" اُس نے ہلکے سے کہا۔

"سونے کے کمرے آجاؤ۔ میں یہاں ہوں۔"

بدھی اندر گئی۔ کمرے میں بہت ہلکی روشنی تھی۔ مسز جیمس ایک کرسی پر بیٹھی تھیں۔ کمرے میں صرف اُن دو موم بتیوں کی روشنی تھی جو کارنس پر فریم میں لگی ایک تصویر کے سامنے جل رہی تھیں۔ مسز جیمس کی کرسی کے سامنے ایک چھوٹی سی میز پر ایک بڑا سا کیک رکھا تھا جس میں بنا جلی دس موم بتیاں لگی تھیں۔ بدھی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کبھی وہ تصویر کو دیکھتی کبھی مسز جیمس کو اور کبھی کیک کو۔

"آج میری بیٹی کی سالگرہ ہے۔" مسز جیمس نے کہا۔

"آپ کی بیٹی.......... سالگرہ.......... مگر.............. کہاں.......... کہاں ہے وہ؟" حیرت سے بدھی ہکلانے لگی۔

"وہاں" مسز جیمس نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ بدھی نے اُس کی طرف دیکھا۔ لگ بھگ اُسی کی عمر کی ایک لڑکی کا مُسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔

"دو سال پہلے اچانک بیمار ہو کر وہ چلی گئی۔" مسز جیمس نے پھر سے بولنا شروع کیا۔ وہ پھر خاموش ہو گئیں جیسے اُن سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا ہو۔ آہستہ سے وہ کرسی سے اٹھیں اور لائٹ جلا دی۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ مسز جیمس تصویر کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئیں اور چپ چاپ اُسے دیکھنے لگیں۔ کچھ دیر بعد اُنھوں نے کہا "تم اُس سے بہت ملتی ہو۔ تم بالکل ویسے ہی بولتی ہو جیسے وہ بولتی تھی۔ تم ہنستی بھی بالکل اُس کی طرح ہو۔ تمھیں غصہ بھی بالکل اُس کی طرح ہی آتا ہے۔ جب میں نے تمھیں پہلی بار دیکھا تو چونک گئی۔ مجھے لگا جیسے میری ماریا واپس آگئی ہے۔ میں چاہتی تھی کہ ماریا کا سارا پیار تم پر نچھاور کر دوں۔ وہ سب چیزیں تمھیں دوں جو اُسے اچھی لگتی تھیں، تمھیں وہ سب کھلاؤں جو اُسے پسند تھا۔ میں چاہتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ دیر تمھارے پاس رہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ
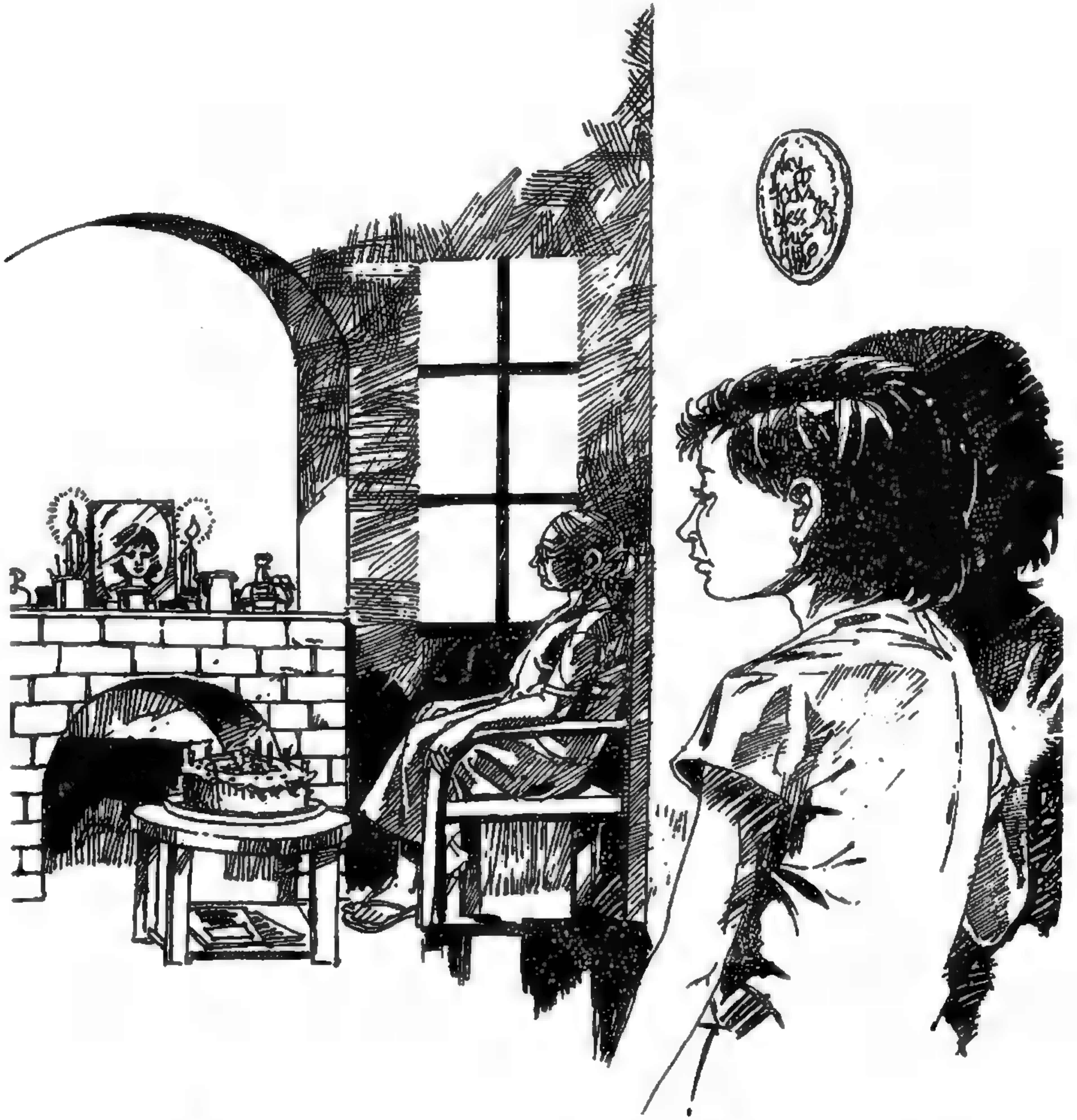
تمھاری زندگی میں اتنا دخل دینا غلط تھا۔ مگر میں کیا کرتی مجبور تھی۔ تم میرے لیے ماریا تھیں۔"
مسز جیمس نے آنسو پونچھے۔
بدھی کی حالت خراب ہو گئی۔ اپنی خود غرضی کی وجہ سے اس وقت اسے خود سے نفرت سی

محسوس ہو رہی تھی۔ اور سب سے زیادہ ذلت تو اُسے اپنی دھو کے بازی پر محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے آہستہ سے کہا "پلیز مجھے معاف کر دیجئے آنٹی۔ میں نے آپ کو بہت تکلیف دی ہے۔"

"ارے نہیں نہیں، ایسا مت سوچو میری بیٹی، تمھیں نہیں معلوم تم نے مجھے کتنی خوشیاں دی ہیں اس وقت یہاں آکر۔ آؤ چلو ہم لوگ کھانا کھائیں۔ میں نے تمھارا کھانا ابھی تک گرم رکھا ہے۔" مسز جیمس نے کہا اور پھر آگے بولیں۔ "میں نے تمھاری پسند کا چوکلیٹ کیک بھی بنایا ہے۔"

"مزہ آگیا، مگر پہلے میں یہ کیک کاٹوں گی اور موم بتیاں بُجھاؤں گی۔ سالگرہ کا دن ہے نا آخر یہ" بِد مٹی نے کیک کاٹا اور ایک ٹکڑا مسز جیمس کو دیا اور ایک ٹکڑا اُس نے اپنے منہ میں رکھا اور پھر شرما کر کہا "آنٹی، آج کے بعد سے آپ میری 'ماں' ہیں اور میں آپ کی 'بیٹی'۔"
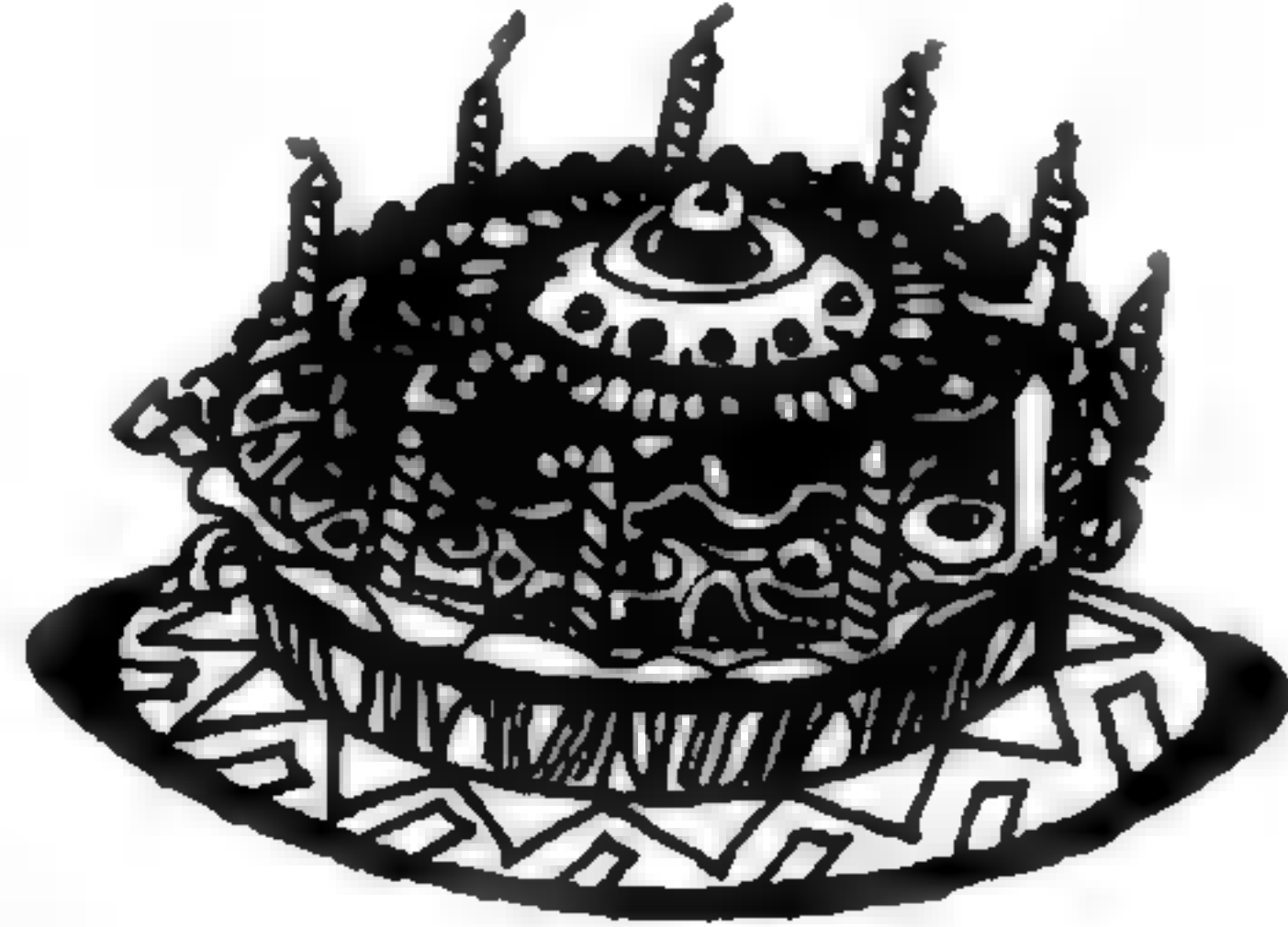
فریبی کی جنت

لال اینٹ کی دیواروں اور سفید ڈھلوان چھت کا وہ بہت خوبصورت سا مکان تھا۔ سامنے کی طرف چھوٹا سا برآمدہ بڑی بڑی بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور گیٹ سے گھر تک آنے والے راستے کے دونوں طرف صاف ستھری پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ لوہے کے چھوٹے سے گیٹ کے دونوں طرف اینٹوں کے بنے ہوئے کھمبے تھے۔ دونوں کھمبوں میں سامنے کی طرف سفید سنگ مرمر کی پٹیاں لگی تھیں۔ اُلٹے ہاتھ کی پٹی پر لکھا تھا۔ ''انسانیت کا خادم۔ ڈاکٹر سدانند'' اور دوسری سیدھے ہاتھ والی پٹی پر لکھا تھا۔ ''فریبی کی جنت۔''

اُس گھر میں رہنے والے آدمی کو آس پاس کے لوگ 'ڈاکٹر دادا' کہتے تھے۔ وہ ایک لمبا چوڑا آدمی تھا۔ اُس کے سفید بال بہت سلیقے سے پیچھے کی طرف بنے رہتے تھے اور اُس کی موٹی موٹی مونچھیں اُس کا اوپری ہونٹ چھپائے رہتی تھیں۔ اسٹیل کے فریم کا گول چشمہ ہمیشہ ناک سے پھسل کر ناک کی نوک پر ٹِکا رہتا تھا۔

ڈاکٹر دادا کبھی اُن مریضوں سے پیسے نہیں لیتے تھے جو ہر روز صبح اُن کے گھر جمع ہوتے تھے۔ اِس بات پر مجھے ہمیشہ تعجب ہوتا تھا کیونکہ میں نے پاپا سے اکثر سُنا تھا کہ دوائیں کافی مہنگی آتی ہیں۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں جب میں گھر پر رہا تو میں نے اُنھیں صرف دن میں ایک بار دیکھا۔ اور وہ بھی اُس وقت جب وہ ٹہلنے نکلتے تھے۔ ہر شام کو وہ میرے گھر کے قریب سے گزرتے تھے جب میں مُنیا کے ساتھ باغ میں کھیل رہا ہوتا تھا۔

ڈاکٹر دادا کو دیکھ کر مجھے اپنے دادا یاد آتے تھے اور پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ اُن کے ساتھ ضرور کچھ مزے دار اور سنسنی خیز کہانیاں جڑی ہوئی ہیں۔ میرا ہمیشہ دل چاہتا تھا کہ اُن سے ملاقات کروں۔ مگر کبھی موقع نہیں ملا۔ ایک دن دوپہر کو پیڑ پر چڑھا میں مُنیا کے لیے آم توڑ رہا تھا۔ حالانکہ ممی نے ہمیں سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ ہم دوپہر میں گھر کے اندر ہی رہیں۔

مجھے آج تک یاد نہیں آتا کہ میں گرا کیسے تھا' مگر ہوا یہی کہ میں زمین پر جا پڑا۔ کمر پر گہری چوٹ لگی۔ اب گھر میں جا کر ممی کا سامنا کرنے کا مطلب تھا کہ زوردار ڈانٹ اور مناسب سزا ملے گی۔ میں نے موقعے کا فائدہ اٹھایا اور ڈاکٹر دادا کے گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ دروازے پر پیتل کا کنڈا چمک رہا تھا۔ میں نے دو بار اُسے کھٹکھٹایا اور انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر اندر سے ایک بھاری سی آواز گونجی۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں دادا' دیپو' مور بنگلے والا لڑکا۔" میں نے جواب دیا۔

دو چار منٹ بعد دروازہ چرمرا کر کھلا اور ڈاکٹر دادا چشمہ ناک پر جمائے قریب آکر مجھے گھورنے لگے۔

"نمستے دادا" میں نے گھبرا کر کہا۔

"آہا تو تم دیپو ہو" اُنھوں نے کہا "اندر آجاؤ لڑکے"

میں نے دروازہ بند کیا اور ان کے پیچھے پیچھے گھر میں چلا گیا۔ جس کمرے میں وہ مجھے لے کر گئے وہ بہت بڑا تھا۔ لکڑی کی الماریوں میں ڈاکٹری کی کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ دو الماریوں میں دواؤں کی شیشیاں ڈبے اور پتے بکھرے پڑے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں ایکس رے کی مشین رکھی تھی۔

"آؤ اِدھر بیٹھو لڑکے اور بتاؤ کہ ایسی کیا بات ہو گئی جو تمھیں یہاں آنا پڑا" ڈاکٹر دادا نے اپنی میز کے پاس پڑی ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کرسی پر بیٹھ کر اپنی ٹی شرٹ اٹھائی "کیا آپ اس پر ذرا سی کوئی اینٹی سیپٹک لگا دیں گے دادا؟"

دادا نے اپنا چشمہ نیچے کیا اور جھک کر دیکھا "ہوں" کافی چوٹ لگی ہے' پیڑ پر چڑھے تھے' کیوں؟" اُنھوں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"میں جب چھوٹا تھا تو پیڑوں پر چڑھنے کا مجھے بھی بہت شوق تھا۔" اُنھوں نے کہا اور اس میز کی طرف بڑھے جس پر ایک پیالے میں روئی رکھی ہوئی تھی۔ انھوں نے تھوڑی سی روئی ایک لال سی دوا میں ڈبوئی اور میری چوٹ پر رکھ دی۔ میں تکلیف سے تڑپ گیا۔ "تھوڑی سی تکلیف ہو گی اس سے

بیٹے" اُنھوں نے کہا اور میری ٹی شرٹ نیچے کر دی۔ "بس چوٹ کو چھونا نہیں۔ یہ ایک دو دن میں اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گی۔"

میں نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ دوائیں' قیمتی کتابیں' ایکسرے مشین' ہر چیز کو دیکھ کر بس ایک ہی سوال کھڑا ہو تا تھا۔ ڈاکٹر دادا آخر مریضوں سے پیسے کیوں نہیں لیتے؟

میں اپنے آپ کو روک نہیں پایا اور اپنی ساری ہمت کو جمع کر کے میں نے بات شروع کی "دادا' آپ بُرا تو نہیں مانیں گے اگر میں آپ سے ایک سوال پوچھوں؟"

ڈاکٹر دادا دوا کی شیشی بند کر رہے تھے۔ مڑ کر اُنھوں نے کہا۔ "نہیں بیٹے' میں بالکل بُرا نہیں مانوں گا۔" اُنھیں تھوڑی سی حیرت ہو رہی تھی۔ "بولو!"

"دادا" میں نے اور زیادہ ہمت کر کے کہا "آپ اپنے مریضوں کو اچھی طرح دیکھتے ہیں اور اچھی سے اچھی دوائیں دیتے ہیں مگر پیسے لینے سے انکار کر دیتے ہیں! ایسا کیوں کرتے ہیں' دادا؟"

ڈاکٹر دادا نے ایک منٹ میری طرف دیکھا' پھر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ "تمھیں معلوم ہے بیٹے" اُنھوں نے پیار سے کہا "زندگی میں کچھ ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن کا علم کتابوں سے نہیں ملتا۔ وہ صرف تجربے سے سیکھی جاتی ہیں۔ اور اِسی طرح میں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا سبق سیکھا' بہت سال پہلے' جب میں جوان تھا اور نیا نیا میڈیکل کالج سے نکلا تھا۔" وہ رُکے اور میری طرف دیکھا۔ "یہ ایک لمبی کہانی ہے شاید تم بور ہو جاؤ گے۔"

میں نے تیزی سے سر ہلایا اور زور دے کر کہا کہ مجھے یہ جاننے کا بے حد شوق ہے کہ آخر وہ کیا بات ہے جس نے انھیں ایسا بنا دیا ہے۔

"ٹھیک ہے" اُنھوں نے سر ہلا کر کہا اور اُن کی آنکھیں اس طرح دور کہیں دیکھنے لگیں جیسے وہ گزرے ہوئے زمانے کو دیکھ رہے ہوں۔

"مجھے واقعی یاد نہیں کہ یہ کتنے دن پہلے کی بات ہے۔ پچیس سال سے زیادہ ہی ہونا چاہیے۔ میرے دادا کی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ جس دن میں میڈیکل کالج سے اپنی پڑھائی ختم کر کے لوٹا بہت خوشیاں منائی گئیں۔ میرے دادا نے میرے کندھے تھپتھپا کر کہا "مجھے تم پر فخر ہے میرے بیٹے۔"

ڈاکٹر داوا اپنے بیتے دنوں میں چلے گئے تھے اور اب انھیں اپنے آس پاس کی چیزوں کے ہونے نہ ہونے کی بھی شاید کوئی خبر نہیں تھی۔ "پھر" وہ بولتے رہے "ایک مہینے بعد' مجھے کرشنا پور کے ایک چھوٹے سے اسپتال میں نوکری کے لیے بھیجا گیا۔ یہ میری پہلی نوکری تھی اور میں بہت گھبرایا ہوا تھا۔ جب میں ٹرین میں بیٹھنے لگا تو میرے داوا نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا 'یاد رکھنا سدا بیٹے' سب سے پہلی چیز تمھارا فرض ہے اگر کسی کو تمھاری مدد کی ضرورت ہو تو تمھیں کسی بھی جگہ جانے کے لیے ضرور تیار رہنا چاہیے۔ ' اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے جب اُنھوں نے مجھے الوداع کہا۔"

ڈاکٹر داوا کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں "کرشنا پور" اُنھوں نے آگے کہا "ایک سویا سویا چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اسپتال بھی چھوٹا سا تھا اور میرے رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ برج موہن ایک نوجوان لڑکا' جس کی عمر پندرہ سال کے آس پاس تھی' روز صبح آکر میری میز کی دھول جھاڑتا اور میری چیزیں قاعدے سے رکھتا۔ وہ ایک نمبر کا باتونی تھا اور گاؤں کے لوگوں کے بارے میں ساری تازہ خبریں مجھے پہنچاتا تھا۔

"بھوت پریت کے قصّے بھی اُسے بہت پسند تھے' مجھے اُس کے کسی قصّے پر کبھی یقین نہیں آتا تھا اور اکثر میں اُسے چپ کرا دیتا۔ 'ارے صاحب آپ شہر سے آئے ہو اس لیے آپ آرام سے میرے اوپر ہنس لو۔' وہ مجھ پر الزام لگاتا اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ 'رُک جایئے آپ اپنی آنکھ سے بھوت پریت دیکھ لیں گے ایک دن!'

"پھر ایک دن برج موہن بھاگتا ہوا میرے پاس آیا' صاحب' اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی 'کل رات گنگونائی کو آم کے باغ والی سڑک پر بھوت نظر آیا تھا۔'

"میں نے غصّے سے گھور کر برج کو دیکھا۔ 'نہیں صاحب غصّہ مت کیجیے۔' اُس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ 'میں آپ کو خبردار کرنے آیا ہوں کیونکہ آپ روز شام کو اُسی راستے سے گھر جاتے ہیں۔'

"میں روز اُسی راستے سے جاتا ہوں اور مجھے تو کبھی کوئی عجیب چیز نظر نہیں آئی' میں نے برج کو بتایا۔ 'وہ سڑک سنسان ہے صاحب اور بھوت رات کو نکلتے ہیں۔ میری بات مانیے صاحب' اگر آپ کو رات کو اکیلے جانا ہو تو کسی سے بات کرنے کے لیے مت رکیے گا۔ وہ سب بدروحیں ہوتی ہیں' بھیس

بدل کر آتی ہیں بات ما ہیے صاحب' برج بڑبڑاتا رہا اور میں نے اُس کی طرف سے کان بند کر لیے۔"

ڈاکٹر صاحب رُکے اور میری طرف دیکھا "مگر تمھیں معلوم ہے بیٹے 'ڈر' بھی عجیب چیز ہے۔ یہ کب کیسے دماغ میں رینگ جاتا ہے اور وہاں گھر کر لیتا ہے پتہ نہیں چل پاتا۔ بالکل جیسے خوشبو سختی سے بند کھڑکیوں کے باوجود بھی کمرے میں پھیل جاتی ہے۔ کچھ دن بعد میں بالکل بھول گیا کہ برج موہن نے مجھے کیا بتایا تھا۔

"اور پھر ایک دن مجھے اسپتال میں دیر ہو گئی۔ اُس دن مریض زیادہ آگئے تھے۔ اور جب میں نے فرصت پائی تو سورج ڈوب چکا تھا اور اچھا خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے اور کسی بھی وقت بارش ہو سکتی تھی۔ میں نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا کیونکہ میں بھیگتا یا راستے میں کہیں رُک کر انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

گھر تک راستہ لمبا تھا۔ گاؤں کا بازار پار کرتے گھپ اندھیرا چھا گیا۔ طوفان کے ڈر سے گاؤں کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے تھے۔ گلیاں سنسان تھیں۔ میں نے اور تیز چلنا شروع کر دیا اور تھوڑی دیر میں آم کے باغ کے پاس سے گزرنے والی سڑک پر پہنچ گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ کیا ہوا تھا پر اچانک ہی مجھے زیادہ ڈر محسوس ہونے لگا۔ مجھے برج موہن کے الفاظ یاد آئے۔ میں نے ان خیالات کو دماغ سے نکال پھینکنے کی کوشش کی مگر میرا ڈر بڑھتا گیا۔ مجھے لگا کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میں پیچھے مڑا اور جیسے جم کر رہ گیا۔

"ایک عورت تھوڑی دور کھڑی تھی۔ بارش شروع ہو گئی تھی اور میں اُس کی شکل نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھ اُٹھائے اور اشارے سے مجھے اپنی طرف بُلایا۔ میں تیزی سے گھر کی طرف قدم بڑھائے۔'ڈاکٹر صاحب! بھگوان کے لیے رک جاؤ، اُس کی گڑگڑاتی ہوئی آواز بارش کی آواز کے ساتھ سنائی دی۔

"میں تیز تیز چلنے لگا۔ تقریباً دوڑ کر۔'نہ صاحب نہ۔ رُک جاؤ۔ مت جاؤ۔ میری بیٹی بہت بیمار ہے۔ آپ دیکھ لو اُسے 'رُکو صاحب رُکو!'

"برج موہن کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے 'کسی سے بات کرنے کے لئے مت

رکیے گا' صاحب' وہ سب بدروحیں ہیں بھیس بدل کر آتی ہیں۔'

"میں تیزی سے دوڑنے لگا۔ 'رک جاؤ ڈاکٹر صاحب' رک جاؤ' ذرا دیر میں عورت کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔

"میں گھر پہنچا' پھولی ہوئی سانس' بکھرے ہوئے بال' ڈرا ہوا اور بھیگا ہوا۔ میں نے کانپتی انگلیوں سے باہر کے دروازے کا تالا کھولا اور اندر پہنچتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ چین کی سانس لی اور اپنی اچھی قسمت ہونے کا شکر ادا کیا کہ میں حفاظت سے گھر پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بستر پر لیٹنے کے بعد

میں سوچنے لگا کہ برج موہن سنے گا تو کیا کہے گا۔ اُس کے چہرے پر پھیلی ہوئی مُسکراہٹ مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔

"اگلے دن صبح میں اسپتال جا رہا تھا تو گزری ہوئی رات کی بات مجھے ایک بھولا بسرا خواب معلوم ہو رہی تھی۔ سورج چمک رہا تھا اور ہر چیز اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ جب میں آم کے باغ والی سڑک پر پہنچا تو میں نے دیکھا ایک جھونپڑی کے پاس بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔ وہ سب اُسی جگہ جمع تھے جہاں کل رات مجھے وہ عورت ملی تھی۔ میں جلدی سے بھیڑ کے پاس گیا 'کیا ہوا؟' میں نے بھیڑ میں راستہ بناتے ہوئے پوچھا۔ ایک عورت جو اپنی ساڑی کے پلو میں منہ چھپائے سسکیاں لے رہی تھی میری طرف دیکھ کر بولی 'صاحب' شیلا بائی کی بچی مر گئی آج صبح۔"

"اچانک جیسے ہر چیز خاموش اور ساکت ہو گئی۔ مجھے آس پاس نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا نہ کوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بس میرے کانوں میں عورت کے گڑگڑانے کی آواز آ رہی تھی اور میری نظروں میں صرف دادا کا چہرہ گھوم رہا تھا' اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ 'تم نے میرے بھروسے کو ٹھیس پہنچائی ہے میرے بیٹے! نہیں بلکہ تم نے خود اپنے بھروسے اور اپنے یقین کو توڑا ہے۔' ہاں میں نے ہی سب ک ساتھ فریب کیا' ان کی محبتوں' ان کی اپنائیت کو ٹھیس پہنچائی اور سب سے زیادہ دھوکا میں نے اپنے آپ کو دیا۔

"وہ شیطان میں ہوں' انسان کے بھیس میں حیوان؟ مجھے ہوش آیا۔ شیلا بائی کہہ رہی تھی 'ارے میں تمھیں کتنے بھی پیسے دے دیتی اگر تم نے اُسے دیکھ لیا ہوتا' اُس نے رو کر کہا 'تم ڈاکٹر نہیں' تم جانور ہو جانور۔'

"مجھ سے گاؤں والوں کے طعنے اور ان کی نفرت بھری نگاہیں برداشت نہیں ہوئیں۔ میں نے کچھ دن بعد کرشنا پور چھوڑ دیا۔ بوجھل دل کے ساتھ۔ اپنی نظروں میں میری کوئی عزت نہیں رہ گئی تھی۔

"پھر میں جہاں بھی جاتا شیلا بائی کی صورت میرا پیچھا کرتی' مجھے پریشان کرتی' میرے کانوں میں اُس کی درد بھری آواز گونجتی رہتی۔ میں نے ڈاکٹری کا پیشہ چھوڑ دیا۔

"اُس کے بعد تین سال تک میں نے ایک بوڑھے فرانسیسی پادری سے' جو اِسی شہر میں اسکول

ٹیچر تھا' فرانسیسی زبان سیکھی۔ ایک دن جب اُسے پتہ چلا کہ میں نے اپنا ڈاکٹری کا پیشہ کیوں چھوڑ دیا ہے تو اُس نے مجھ سے کہا ہر آدمی غلطی کرتا ہے بیٹے مگر اُس کی وجہ سے اپنی باتیں تو نہیں چھوڑ دیتا۔ یاد رکھو' اس شہر کے غریب لوگوں کو تمھاری ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ تمھیں اُن سے پیسے لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

ڈاکٹر دادا نے رُک کر میری طرف دیکھا۔ "میں نے کچھ پیسے جمع کر کے دوائیں خریدیں۔ اسکول میں ہفتے میں تین دن فرانسیسی زبان پڑھا کر' اور میڈیکل کے رسالوں میں مضامین لکھ کر جو پیسے کمائے اُن سے یہ کلینک چلانے لگا۔"

کمرے میں خاموشی تھی۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سورج ڈوب چکا تھا اور اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں نے ہلکے سے کرسی کھسکائی "اب مجھے جانا چاہیے دادا" میں نے بہت احترام کے ساتھ کہا۔

ڈاکٹر دادا نے' جو گود میں ہاتھ رکھے فرش کو گھور رہے تھے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا
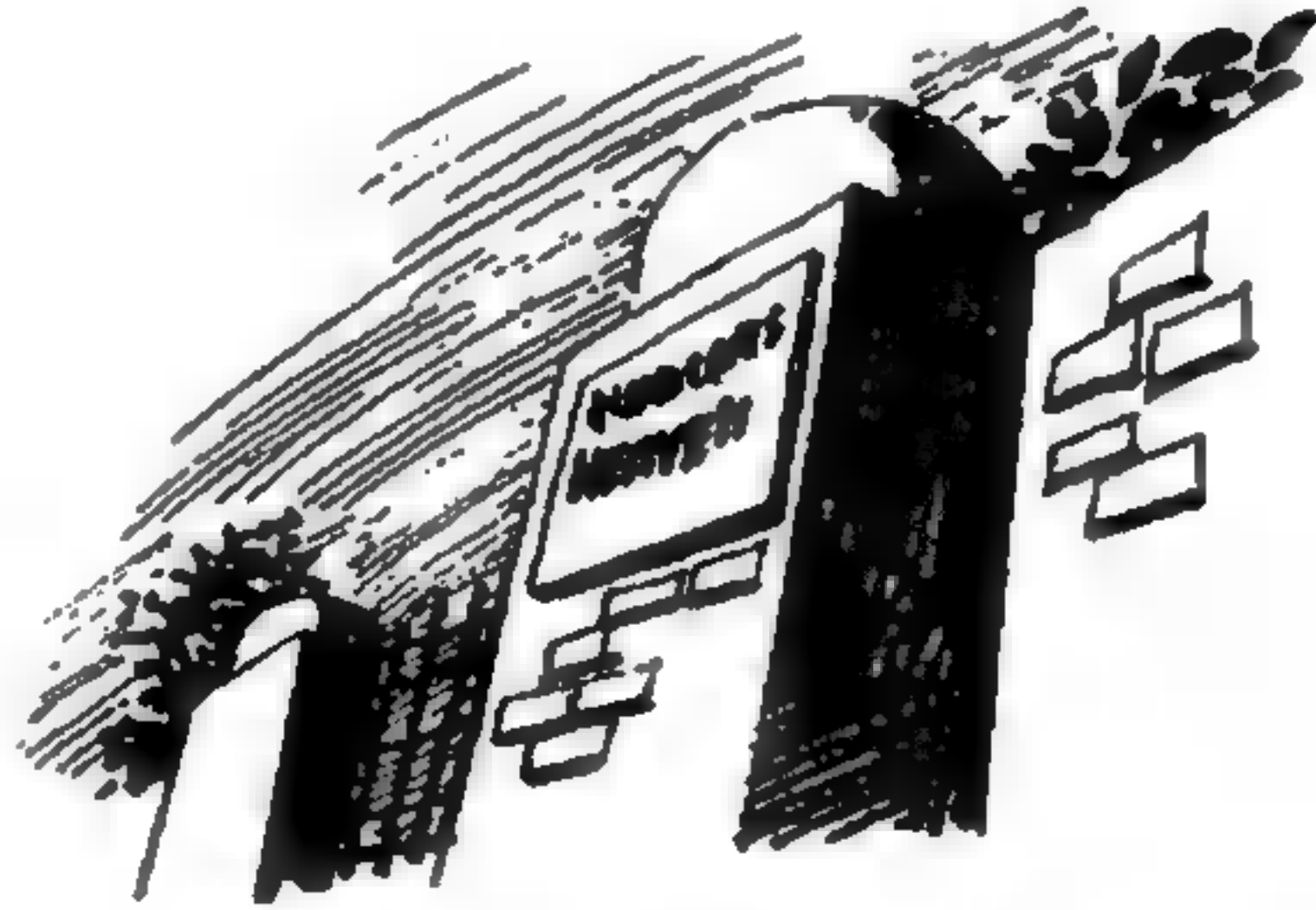
"اوہ! ہاں ہاں بیٹے' بھاگو اب جلدی سے' اندھیرا ہو گیا ہے"

میں دروازے کی طرف بڑھا۔ میرے دماغ میں دادا کی ساری باتیں گھوم رہی تھیں "ارے ہاں تمھیں اندھیرے سے ڈر تو نہیں لگتا دیپو؟"

میں نے زور زور سے سر ہلا کر انکار کیا۔ اُس وقت مجھے جس چیز سے ڈر لگ رہا تھا وہ میں نے دادا کو بتادی اور وہ تھی ممی کی کراری ڈانٹ جو یقیناً مجھے ابھی جھیلنی تھی۔

میں مُڑا اور دوڑ لگادی۔ دادا کے ہنسنے کی آواز مجھے اب بھی سنائی دے رہی تھی۔

بُھوت بنگلہ

"کتنا خوبصورت باغ ہے۔" جھانسی کی ریلوے کالونی میں اپنے نئے بنگلے میں گھستے ہیں آشا چلائی۔

"ذرا اُس پیڑ کو دیکھو' اپنی سفید اور چمک دار چھال کی وجہ سے کتنا عجیب سا لگ رہا ہے نا؟" اوشا نے سب کو وہ پیڑ دکھایا۔

آشا' اوشا دونوں جڑواں بہنیں' ان کے ماں باپ اور ان کی بوڑھی نوکرانی رکھما' سب لوگ اُس بڑے بنگلے میں آکر بہت خوش تھے۔ بنگلے کے ساتھ بڑا باغ' اور پیچھے ایک چھوٹا سا گھر۔

"یہ کمرہ ہمارا رہے گا" آشا اور اوشا نے ایک کمرہ چُن لیا جہاں سے سامنے والا باغ' اِس کونے سے اُس کونے تک صاف نظر آتا تھا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ چلو یہ تمھارا کمرہ ہو گیا۔" ماں نے کہا۔ "مگر اپنی کتابیں اور کپڑے خود لگانا شروع کر دو تاکہ رکھما باورچی خانے میں میری مدد کر سکے۔"

نئے گھر کو سجانے سنوارنے میں دن تیزی سے گزر گیا۔ سب لوگ جلدی ہی سونے لیٹ گئے۔

"آشا بٹی' اوشا" کسی نے سرگوشی میں پکارا۔

آشا فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی "یہ کیا ہے؟ کون ہے یہ؟" اُس نے پوچھا۔

"میں ہوں رکھما۔ کھڑکی کی طرف دیکھو" اُس نے سرگوشی کی۔

اتنی دیر میں اوشا بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ "وہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ باہر تو اندھیرا ہے۔" آشا نے کہا۔

"وہ دیکھو بڑی سی سفید چیز' لال لال آنکھوں والی' ادھر الٹے ہاتھ کو کونے میں۔ مجھے لگتا ہے وہ بھو...... بھو...... بُھوت ہے۔" رکھما نے کہا۔

"نہیں رکھما' کوئی بُھوت ووت نہیں ہے۔ تمھارا وہم ہے چلو سو جائیں۔" اوشا نے اپنا تکیہ

ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں اوشا بیٹی' ٹھیک سے دیکھو۔ وہاں ہے وہ' میرا وہم نہیں' دیکھو! وہ چل رہی ہے اب"

رکھما نے اپنی بات پر زور دیا۔

"آؤ دیکھیں۔" آشا اور اوشا دونوں کھڑکی کے پاس گئیں۔ اُنھوں نے اپنی ٹارچیں چاروں طرف ڈالیں اور ہنسنے لگیں۔

"بھوت پر مت سوچو آشا بیٹی' وہ تم کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟" اندھیرے میں اچانک آواز سن کر وہ سب اچھل پڑے اور چیخنے لگے۔

"کیوں چیخ رہے ہو؟" اُس کی ماں نے لائٹ جلا کر پوچھا۔

"اوہو ممی آپ نے تو سچ مچ ہمیں ڈرا دیا" آشا اور اوشا چلائیں۔

"پہلے رکھما نے اپنا بھوت کا قصہ شروع کر دیا اور اب آپ......"

"بھوت' کیسا بھوت؟" ماں نے پوچھا۔ اُنھوں نے ماں کو سفید پیڑ دکھایا اور بتایا کہ کیسے رکھما کو اپنی وہمی طبیعت اور بھوت پریت پر پکے یقین کی وجہ سے وہ پیڑ بھوت لگنے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ اب تو تم نے اُسے صحیح بات سمجھا دی۔ اب جاؤ سو جاؤ۔"

اگلے دن آشا اور اوشا اسکول میں سب کی دلچسپی کا مرکز بن گئیں۔ ان کے ٹیچر اور کلاس والے انھیں الگ الگ پہچان نہیں سکے اور لڑکیوں کو انھیں چھیڑنے میں بڑا مزا آیا۔

مگر ایک بات سے آشا اور اوشا کو بہت حیرت ہوئی۔ جیسے ہی اُنھوں نے بتایا کہ وہ ریلوے کالونی کے بڑے بنگلے میں رہتی ہیں ہر ایک نے انھیں گھور کر دیکھا اور فوراً ان سے دور چلا گیا۔ جس چپراسی کو ان کے ابّا نے انھیں اسکول سے گھر پہنچانے کے لیے بھیجا تھا جب وہ اُس کے ساتھ گھر لوٹیں تو وہ بنگلے سے تھوڑی دور ہی رک گیا اور بولا "آشا بی بی' میں اس سے آگے نہیں جاؤں گا۔ اب تو آپ چلی ہی جائیں گی سامنے ہی تو ہے بنگلہ۔"

"ہاں! ہاں! ہم چلے جائیں گے مگر تم بنگلے کیوں نہیں چلتے' چائے پینے؟ ماں نے کہا ہے آفس سے جو بھی ڈیوٹی پر آئے چائے ضرور پیئے؟" اوشا نے کہا۔

"نہیں نہیں۔ مجھے چائے نہیں پینی۔ مجھے تو جانا ہے" کور چپراسی تقریباً دوڑتا ہوا واپس چلا گیا۔
"عجیب آدمی ہے آشا اور اوشا نے کہا اور کھلکھلا کر ہنس دیں۔
"ممی ہم آگئے۔" گھر میں گھستے ہی دونوں نے چلا کر کہا۔
کوئی جواب نہیں ملا۔ سامنے والے کمرے میں بستے پھینک کر وہ کچن کی طرف دوڑیں' سوچا ماں ضرور ان کے لیے کچھ پکا رہی ہو گی۔
"ممی ممی" کچن میں بھی ممی کو نہ دیکھ کر وہ چلائیں۔ وہ اس کمرے سے اُس کمرے میں گئیں مگر ممی کا کہیں پتا نہ تھا نہ رکھما دکھائی دی۔ سارے کمروں میں ڈھونڈنے کے بعد بھی جب اُن میں سے کوئی نہیں ملا تو وہ گھبرا گئیں۔ وہ باغ میں گئیں مگر وہاں بھی اُن لوگوں کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ "آؤ چلو ہم بابو جی کو فون کر دیں انھیں ڈھونڈیں گے۔"
"ہلو۔ ہلو بابو جی' آپ ہی ہے نا؟...... شکر ہے آپ مل گئے۔ نہیں ہمیں کچھ نہیں ہوا۔ ہم گھر پر ہیں۔ بابو جی...... بھی...... کیا وہ وہاں ہیں؟ یہاں نہیں ہیں۔ ہم نے سارے کمروں اور باغ میں ڈھونڈ لیا۔ نہیں رکھما بھی نہیں مل رہی۔ بابو جی پلیز جلدی گھر آجائیے۔ نہیں ہم ڈر نہیں رہے مگر آپ جلدی کیجئے۔" اوشا نے ریسیور نیچے رکھ کر آشا کی طرف دیکھا۔
اچانک آشا چلائی "پیچھے باغ والا گھر۔ آؤ ہم وہاں دیکھیں۔ ہو سکتا ہے ممی اور رکھما اس کی صفائی کر رہی ہوں۔" دونوں نے پیچھے باغ والے گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔
پیچھے باغ والے گھر تک جانے والا راستہ کانٹے دار جھاڑیوں سے بھرا پڑا تھا۔ "کاش ہمارے پاس ایک کتا ہوتا تو ہماری مدد کرتا۔" آشا نے کہا۔
"ہائے ممی" اُسے اوشا کی چیخ سنائی دی۔
"کیا ہوا؟" آشا نے مڑ کر دیکھا۔ اوشا اپنا ٹخنہ پکڑے ایک پیر پر کود رہی تھی۔ "میرے چوٹ لگ گئی۔ لگتا ہے خون نکل رہا ہے۔"
"آؤ واپس چلیں پہلے تمھارے چوٹ پر پٹی باندھ لیں۔ پھر تلاش کریں گے۔"
آشا نے اوشا کی چوٹ دیکھی جس سے خون بہہ رہا تھا اور اُسے سنبھالتے ہوئے کہا۔

"نہیں تم جاؤ۔ میں چوٹ پر خود پٹی باندھ کر آتی ہوں۔" اوشا نے کہا۔
"تم خود کیسے باندھو گی۔ تم تو دیکھ بھی نہیں سکتیں اسے۔ چلو ہم دونوں مل کر باندھ لیں گے۔"
آشا نے زور دے کر کہا۔
"نہیں میں کرلوں گی آشا' تم جاؤ۔"
"نہیں ضدی لڑکی' نہیں' پہلے تمھاری چوٹ...... "اور آشا' اوشا کو گھر کی طرف کھینچ لے گئی۔ جیسے ہی وہ گھر کے قریب پہنچے تو اُنھوں نے دیکھا کہ کوئی دوڑ کر باہر نکل رہا ہے۔ "کون ہے؟" دونوں چلائیں اور دوڑ کر گھر میں گئیں۔ چوٹ سے بہت خون بہہ رہا تھا اس لیے انھیں فوراً باتھ روم میں جانا پڑا۔ چوٹ کو اچھی طرح دھویا۔ "رکو' میں ممی کے کمرے سے اینٹی سیپٹک دوا اور پٹی لاتی ہوں۔" آشا ماں کے کمرے میں گئی مگر اسے دوا اور پٹی وہاں نہیں ملیں۔
"ہے بھگوان' کہاں رکھ دیں' ممی نے یہ چیزیں؟ اس نئے گھر میں تو میں کچھ بھی نہیں ڈھونڈ سکتی۔" کیوں نہ بابو جی کا 'آفٹر شیو' استعمال کرلیا جائے۔؟ وہ بھی تو اینٹی سیپٹک ہوتا ہے۔ باتھ روم میں ان کے شیونگ کے ڈبے میں ہوگا۔" آشا نے باتھ روم کا دروازہ کھولنا چاہا مگر زور سے دھکا دینے پر بھی وہ نہیں کھلا۔
"کیا مطلب! اندر سے بند ہے۔ اف! یہ ممی کی احتیاطیں" اُس نے دروازے کا تالا کھولا۔ "ممی ممی ارے کیا ہوا؟ آپ یہاں کیوں پڑی ہیں؟ اوشا' اوشا' یہاں آؤ ممی یہاں ہیں" آشا چلائی۔ "ممی ممی آشا نے اپنی ماں کے گال تھپتھپائے' پھر ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔
"چلو انھیں پلنگ پر لٹادیں" اوشا نے مشورہ دیا۔ اور ایک طرف سے انھیں اُٹھانے لگی۔ آشا نے دوسری طرف سے اُٹھایا اور دونوں نے مل کر بڑی مشکل سے انھیں بستر تک لے گئی۔
اُسی وقت انھیں اپنے ابا کی کار کی آواز سنائی دی۔ آشا باہر دوڑی۔ "بابو جی' جلدی ڈاکٹر کو بلائیے' ماں بے ہوش ہیں۔"
ڈرائیور سے ڈاکٹر کو لانے کے لیے کہہ کر وہ دونوں جلدی سے اندر آئے۔ اوشا اپنی ماں کے
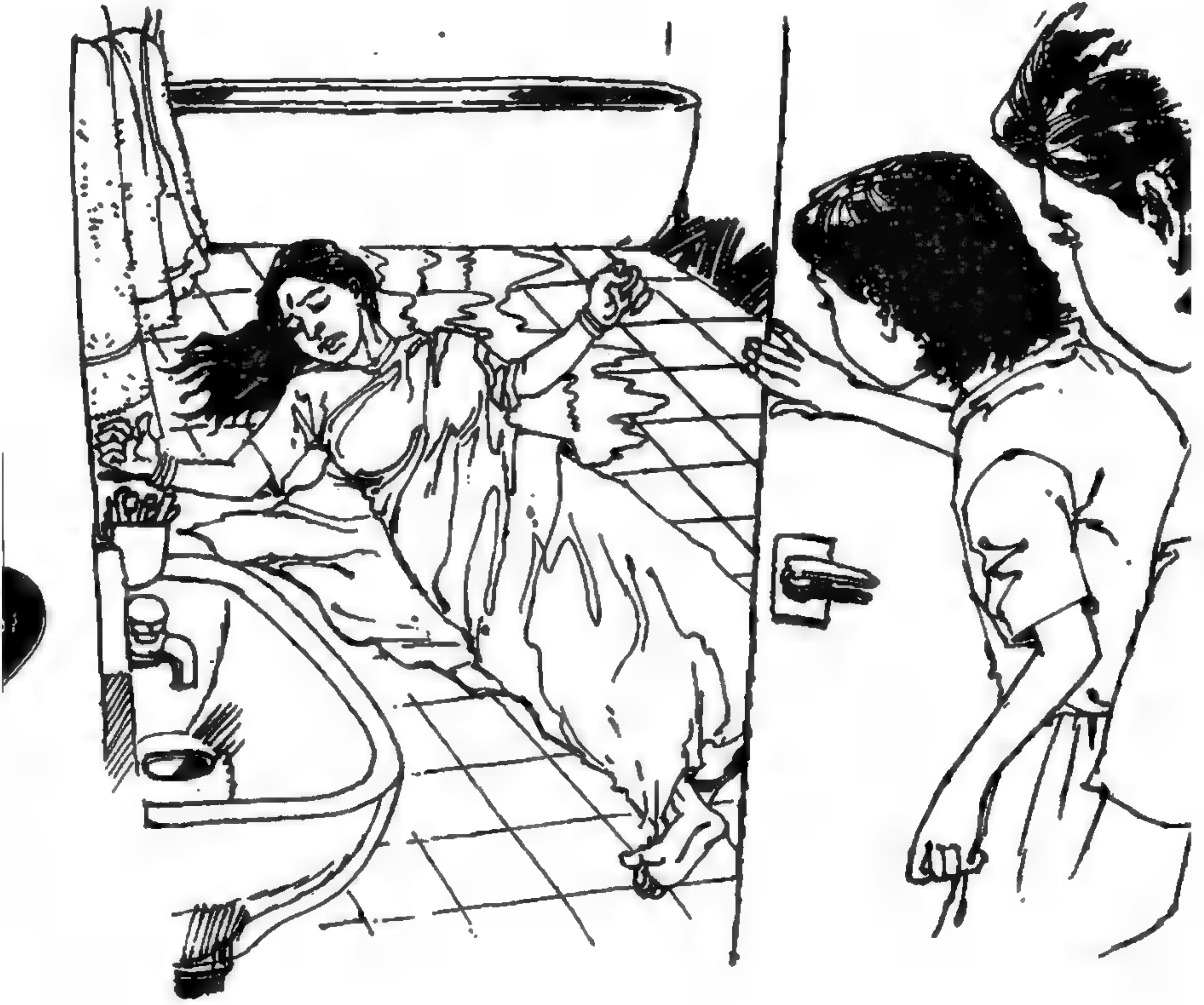
پیروں کی مالش کر رہی تھی۔ انھوں نے ان کے منہ پر اور پانی چھڑکا مگر اُس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

"بابو جی ممی کو کیا ہو گیا ہے؟" آشا اور اوشا نے پوچھا۔ اب وہ بہت گھبرا رہی تھیں۔

"کسی نے ان کے سر پر کچھ مارا ہے مگر مجھے یقین ہے یہ جلدی ہی ٹھیک ہو جائیں گی" بابو جی نے انھیں یقین دلایا۔ "مگر رکھا کہاں ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"یہ ہے رکھا" بابو جی کے ساتھ آنے والا چپراسی رکھا کو لے کر کمرے میں داخل ہوا۔

رکھما کانپ رہی تھی مگر جب اُس نے اپنی مالکن کو بستر پر لیٹے دیکھا تو چلائی "میم صاحب" اور ان کی پیر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

کافی دیر بعد اور کئی گلاس پانی پی کر رکھمانے کہا "میں نے تو پہلے ہی کہا تھا' اُس بنگلے میں بھوت ہے مگر کسی نے میری بات ہی نہیں سُنی۔ کل رات تم نے کہہ دیا کہ وہ پیڑ تھا' آج دوپہر جب رسی پر کپڑے جلنے لگے تو میں نے میم صاحب سے کہا کہ یہ بھوت ہے مگر میم صاحب نے کہا نہیں' یہ تو سورج کی تیز روشنی چھت کے نیچے لگے شیشوں پر پڑنے کی وجہ سے ہوا ہے۔"

"او ہو رکھما' ہمیں پہلے یہ بتاؤ کہ تمھارے اور ماں کے ساتھ ہوا کیا تھا" آشا نے بے صبری سے کہا۔

"تین بجے چائے پینے کے بعد میم صاحب اور میں کمرے میں کپڑے ٹھیک کر رہے تھے۔ ایک بھوت: آیا میم صاحب پر حملہ کیا اور انھیں دھکا دے کر دروازہ بند کر دیا۔ میں اتنی ڈر گئی تھی کہ ضرور بے ہوش ہو گئی ہوں گی کیونکہ اُس کے بعد صرف مجھے یہ یاد ہے کہ مادھو مجھے جگا رہا تھا۔"

"صاحب یہ کوئلے کی کوٹھری میں پڑی تھی' باورچی خانے کے پاس' میں باورچی خانے میں آپ کے لیے چائے بنانے گیا تو مجھے کسی کے کراہنے کی آواز آئی' میں نے تلاش کیا تو مجھے یہ پڑی دکھائی دی۔ میں نے اُس کے منہ پر پانی چھڑکا اور جب یہ ہوش میں آ گئی تو اُسے یہاں لے آیا۔" مادھو نے کہانی پوری کر دی۔

"وہ کوئی بھوت نہیں تھا کوئی چور چوری کرنے آیا تھا۔ ہم نے کسی کو بھاگتے دیکھا تھا۔" جڑواں بہنوں نے کہا۔

"نہیں' بی بی' اس گھر میں بھوت ہے اُسی لیے تو یہ بھوت بنگلہ کہلاتا ہے۔ میں نے بھی صاحب کو بتایا تھا کہ یہاں نہیں آئیں۔" مادھو نے بھی ٹکڑا لگایا۔

"ارے چھوڑو' مادھو میں بھوت پریت کو نہیں مانتا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ بھوت بنگلہ کہلاتا ہے۔ سب نے مجھے ڈرایا تھا مگر میں سرکاری پیسے کا نقصان نہیں چاہتا۔ جب میرے عہدے پر آنے والے کسی بھی افسر کے لیے اتنا بڑا بنگلہ بنایا گیا ہے تو بیکار کیوں رہے۔" بابوجی نے کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں بابوجی' یہاں کوئی بھوت ووت نہیں' وہ ضرور کوئی چور تھا۔ بابوجی

دیکھئے ممی آنکھیں کھول رہی ہیں۔" اوشا نے خوشی کے ساتھ جلدی سے کہا۔

"ممی ممی' آپ ٹھیک تو ہیں؟" آشا نے پوچھا۔

ماں نے مسکرا کر سر ہلا کر 'ہاں' کہنے کی کوشش کی مگر درد سے چیخ پڑیں اور سر پکڑ لیا۔

ڈاکٹر نے ماں کو کچھ دوائیں دیں اور اوشا کی چوٹ پر پٹی باندھ دی۔ اُنھوں نے دونوں کو آرام کرنے کی صلاح دی۔

رات کو دیر گئے آشا اور اوشا دن بھر کے واقعات پر بات چیت کرتی رہیں۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ ان کے اسکول کی لڑکیاں یہ سن کر کہ وہ لوگ کہاں رہتے ہیں ان کی طرف حیرت اور تعجب سے کیوں دیکھ رہی تھیں۔

قدموں کی آہٹ سن کر وہ دونوں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ پھر پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ آشا کھڑکی کے پاس گئی مگر کچھ نظر نہیں آیا۔

"کچھ نہیں ہے۔" اُس نے اوشا کو بتایا۔

"تیز ہوا سے پتیاں ہل رہی ہوں گی۔ چلو سو جائیں۔" اوشا کمبل میں گھس کر بولی۔

ابھی اُنھوں نے اپنی آنکھیں ٹھیک سے بند بھی نہیں کی تھیں کہ رکھما چلائی "میم صاحب بھوت"

"کون ہے؟ کیا ہے؟" آشا نے ٹارچ جلائی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بابو جی بھی کمرے میں آ گئے اور لائٹ جلا دی۔

"میم صاحب" رکھما اب بھی دونوں ہاتھ گالوں پر رکھے اور آنکھیں بند کیے کراہ رہی تھی۔

"کیا ہوا رکھما؟ کیا کوئی ڈراونا خواب دیکھا تھا؟" آشا نے پوچھا۔

رکھما کچھ بول نہیں پائی بس سر ہلا کر رہ گئی۔

"میں ہوں' آشا' رکھما کوئی بھوت نہیں۔ کیا ہوا؟"

آشا نے پوچھا اور اُس کے گالوں سے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ رکھما کے ہاتھوں پر خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔

"بابوجی رُکھما کے تو چوٹ لگی ہوئی ہے۔ اور یہ تو بری طرح ڈری ہوئی ہے۔" آشا نے اُسے ایک گلاس پانی دیا۔ جب وہ پلنگ کے پاس رکھی میز پر گلاس واپس رکھ رہی تھی تو اُسے خرخراہٹ سی سنائی دی۔ اُس نے جُھک کر دیکھا تو اُسے پلنگ کے نیچے ایک پیلی دھاری دار بلی نظر آئی۔"

"اچھا تو تم ہو وہ بھوت جس نے رکھما کو ڈرایا ہے۔ چلو بھاگو یہاں سے۔" آشا نے بلی سے کہا۔

بلی نے میاؤں کیا اور دروازے کی طرف بھاگنے کے بجائے کھڑکی کی طرف گئی اور کود کر باہر نکل گئی۔

"یہ کھڑکی بند کر دیں' تاکہ یہ پھر سے نہ آجائے۔" بابوجی کھڑکی بند کر کے باہر چلے گئے۔

خاموشی ہو گئی۔ مگر آشا اور اوشا سو نہیں پائیں۔ وہ سوچنے لگیں۔ 'بلی دروازے سے باہر جانے کے بجائے کھڑکی سے کیوں گئی۔' ضرور اس کی کوئی وجہ ہو گی" آشا میرا دل چاہتا ہے ہم باہر جا کر دیکھیں۔" اوشا نے کہا۔

"باہر جانے کا کوئی چانس نہیں میڈم' تمھارے پیر میں چوٹ لگی ہے اور تمھیں آرام کی ضرورت ہے' اگر کوئی باہر جا سکتا ہے تو وہ میں ہی ہوں۔ مگر بابوجی ابھی جاگ رہے ہوں گے' اور میں انھیں پریشان نہیں کرنا چاہتی۔" آشا نے جواب دیا۔

وہ آرام سے لیٹ گئیں۔ کچھ دیر بعد انھیں ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی کھڑکی کے پاس چل رہا ہو۔ انھیں ایک سایا سا بھی نظر آیا۔ سایا قریب آیا۔ وہ کھڑکی کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "ہلنا مت اوشا' میں رینگتی ہوئی جاؤں گی اور لائٹ جلا دوں گی۔" آشا نے سرگوشی میں کہا۔

"نہیں لائٹ مت جلاؤ ہو سکتا ہے رکھما چلانے لگے اور ماں اور بابوجی کو جگا دے۔ ہم دونوں ہی چپ چاپ چلتے ہیں۔" اوشا نے کہا۔

"نہیں تمھارے پیر میں چوٹ ہے۔"

"اب بیکار بات کا بتنگڑ مت بناؤ۔" اوشا نے ضد کی۔

"ہم لوگ پیچھے والے برآمدے سے باہر جائیں گے اور چلا کر چوکیدار کو بلائیں گے۔" اُنھوں نے طے کیا۔

بہت آہستہ سے اُنھوں نے کمبل سرکائے اور اپنے پیر نیچے رکھے۔

"اف!" اوشا اپنی کراہ کو روک نہیں پائی۔

سایا تیزی سے غائب ہو گیا۔ آشا دوڑ کر پچھلے برآمدے میں گئی۔ اوشا پیچھے پیچھے آئی۔ آشا نے بہت آہستہ سے بغیر آواز کیے دروازے کی کنڈی کھولی۔ آہستہ آہستہ اُس نے دروازہ اتنا کھول لیا جس سے باہر جھانکا جا سکے۔

چاندنی میں اُنھوں نے دیکھا چار انسانی جسم ایک ساتھ کچھ کر رہے ہیں۔ وہ سب سفید چادروں میں لپٹے ہیں۔ ان کے چہرے وہ نہیں دیکھ پائیں۔ نہ ہی ان کی باتیں سن پائیں کیونکہ وہ سب سرگوشی میں بات کر رہے تھے۔

"کاش ہم ان کے چہرے دیکھ سکتے۔" آشا نے سرگوشی کی۔

"دیکھو ان میں سے صرف ایک نے جوتے پہن رکھے ہیں باقی سب ننگے پیر ہیں" اوشا نے آشا کے کہنی مار کر کہا۔

"ہاں نظر آ رہا ہے مجھے اور وہ پینٹ بھی پہنے ہے۔"

اچانک ایک سایا سیدھا کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت لمبا آدمی تھا۔ حالانکہ اس کا چہرہ وہ نہیں دیکھ پا رہی تھیں مگر اُنھوں نے سنا وہ کہہ رہا تھا "کچھ بھی کرو کل تک تمھیں ان کو ضرور نکال باہر کرنا ہے۔"

"سدھو ہم نے بھوت والی ساری ترکیبیں آزمالیں۔ سوائے ان کی نوکرانی کے کوئی بھی نہیں ڈرا" ان میں سے ایک نے کہا۔

"ہم نے میم صاحب پر حملہ کیا اُس کے باوجود وہ نہیں گئے۔" دوسرے نے کہا۔

"میں یہ سب نہیں جانتا کچھ بھی کرو۔ ضرورت پڑے تو جان سے مار ڈالو انھیں۔ کل تک انھیں یہاں سے چلا جانا چاہیے۔" آشا اور اوشا کی ڈر کے مارے چیخیں نکلتے نکلتے رہ گئیں۔ اُنھوں نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیے اور ان کی باتیں سننے کی کوشش کرنے لگیں۔

"کل مال گاڑی جانے والی ہے۔ ہمیں لوٹ کا مال چھپانے کے لیے اس گھر کی ضرورت ہے۔ جیسے بھی ہو مجھے پرواہ نہیں۔ مجھے ایک خالی گھر چاہیے کل تک۔" لمبے آدمی سدھو نے کہا اور تیزی سے باغ والے مکان کی طرف چلا گیا۔ باقی تین کچھ دیر تک بات کرتے رہے پھر اندھیرے میں غائب

ہو گئے۔ آشا اور اوشا نے دروازے کی کنڈی لگائی اور بابو جی کے پاس دوڑیں۔

اُنھوں نے جو کچھ سنا تھا بابو جی کو بتادیا۔ بابو جی نے پولیس کو فون کیا۔

"اب ہم چوکیدار کو بلا کر کہہ دیں کہ ہوشیار رہے۔"

بابو جی نے کہا "چوکیدار چوکیدار" اُنھوں نے پکارا۔

"آیا' ساب" اُس نے جواب دیا۔ کافی دیر بعد وہ آیا۔

"چوکیدار' ہوشیار رہنا' اور ٹھیک سے گشت لگانا۔ لڑکیوں نے کچھ آوازیں سنی ہیں اور یہ ڈر گئی ہیں۔" بابو جی نے کہا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے' ساب میں ہوں نا۔"

"چوکیدار کی آواز کچھ سنی سنی سی لگی۔ آشا نے اُس کی پیروں کی طرف دیکھا۔ وہ پینٹ اور

جوتے پہنے تھا" "اوشا! پینٹ اور جوتے!" آشا نے سرگوشی کی۔

اوشا نے آنکھ سے اشارہ کر کے آشا سے کہا چپ رہے۔ وہ سمجھ گئیں کہ چوکیدار اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کر دے گا۔ اور وہ اُسے ایسا کرنے سے روکنا چاہتی تھی۔

بابو جی جیسے ہی دوبارہ فون کرنے گئے وہ دونوں کھسک لیں۔ پولیس تو دیر سے آئے گی۔ اُنھوں نے دروازے کی کنڈی کھولی' دیکھا تو چوکیدار باغ والے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

آشا بغیر آواز کیے اُس کے پیچھے دوڑی۔ "چوکیدار" اُس نے قریب جا کر آہستہ سے پکارا۔ اتنے قریب سے کسی کو اپنا نام لے کر پکارتے سنا تو چوکیدار گھبرا گیا اور دوڑنے لگا۔ آشا نے اُس کا پیچھا کیا۔ وہ بہت تیز دوڑتی تھی۔ جب وہ کافی قریب پہنچ گئی تو اُچھل کر اُس نے چوکیدار کی ٹانگ پکڑلی۔ چوکیدار منہ کے بل گر پڑا۔ آشا فوراً اُس کی کمر پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ چوکیدار نے اٹھنے کی بہت کوشش کی۔

اُسی بیچ اوشا وہاں پہنچ گئی اور دونوں مل کر چلانے لگیں۔ "بابو جی' بابو جی" اُنھوں نے اپنے لا کو آتے دیکھا اور ساتھ ہی پولس کی جیپ کی آواز بھی سنی۔ "ادھر آیئے انسپکٹر" وہ چلائیں۔

چوکیدار کو پولس کے حوالے کر کے' آشا اور اوشا نے انسپکٹر کو باغ والے گھر کی طرف بھیجا اور پھر سب کچھ بہت تیزی سے ہوا۔ انھیں بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں' کچھ فائر ہوئے اور پھر اُنھوں نے دیکھا کہ پولس مجرموں کو پولس کی گاڑی میں لے جا رہی ہے۔

بابو جی اور انسپکٹر گھر میں آئے "شکر ہے بھگوان کا ہم نے ان سب کو پکڑ لیا۔ اور لڑکیو' تمھارا شک ٹھیک تھا' چوکیدار ان کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ اب ریلوے کو اپنا چوری گیا سامان مل جائے گا۔ پچھلے چار پانچ سالوں سے ہم یہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ سامان راستے میں کہاں اور کیسے غائب ہو جاتا ہے۔ اب ہمیں پتہ چلا کہ اس بھوت بنگلے کے بارے میں یہ فرضی قصہ انھیں چھپنے میں مدد دیتا تھا۔ مسٹر پرساد آپ کا اور آپ کی بہادر لڑکیوں کا شکریہ۔ اب میں ان بھوتوں کو ان کے اس اڈے سے بھی اچھی جگہ لے جاؤں گا۔" انسپکٹر کمار نے جیپ پر روانہ ہونے سے پہلے کہا۔

دادی

"مجھے تم سے ایسے کام کی امید نہیں تھی' دھریتی" ٹیچر نے اُس کو گھورتے ہوئے کہا۔ کلاس میں مکمل خاموشی تھی۔ دھریتی آہستہ آہستہ کھڑی ہوئی اور نظر جھکا کر اپنے پیروں کی طرف دیکھنے لگی۔ آنکھوں کے بتیس جوڑے اُسے تعجب سے دیکھ رہے تھے۔

"میرا اِسے کام کہنا بھی صحیح نہیں ہے' یہ کام ہے ہی نہیں" ٹیچر نے اونچی آواز میں آگے کہا اور کاپی اُٹھا کر سب کو دکھائی۔ ساری نظریں کاپی کی طرف اُٹھ گئیں اور خاموشی ٹوٹ گئی۔ کچھ لڑکیوں نے سانس زور سے اندر کھینچ کر "اُف!اُف" کی آواز نکالی اور کچھ نے کہا' ارے' کلاس میں دبی دبی ہنسی کی آواز صاف سنی جاسکتی تھی۔

"اس کا کوئی جواب ہے تمھارے پاس دھریتی؟" ٹیچر نے سختی سے پوچھا۔ ان کے ہاتھ میں کوری کاپی پھڑ پھڑا رہی تھی۔

دھریتی بت کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اُس کی نظریں جیسے فرش پر چپک گئی تھیں۔

"آخر تم نے یہ کوری کاپی کیوں جمع کی جبکہ میں نے تمھیں پورا ایک گھنٹہ دیا تھا۔ مضمون لکھنے کے لیے؟" ٹیچر نے پوچھا۔

بھاری خاموشی چھا گئی۔ دھریتی نے نہ نظر اٹھا کر دیکھا اور نہ کچھ بولی۔

"کیا تمھارے پاس قلم نہیں تھا؟" ٹیچر نے سوال کیا۔

دھریتی نے سر ہلا کر انکار کیا

"کیا تم بیمار ہو؟" دھریتی نے پھر سر ہلا کر منع کیا۔

"تو پھر کیا بات ہے؟ بولو۔ بتاؤ۔ میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔" ٹیچر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

آخر کار دھریتی نے آہستہ سے بغیر اوپر دیکھے کہا "کیونکہ...... کیونکہ میری کوئی دادی نہیں ہیں۔" اُس کے پاس بیٹھی وئیشالی نے دیکھا کہ اُس کے چہرے سے آنسو ڈھلک رہے تھے۔

گھنٹہ بج گیا۔ ٹیچر کلاس سے چلی گئیں۔ لڑکیاں ٹولیوں میں بٹ کر باتیں کرتی، ہنستی، کلاس سے باہر دوڑنے، بھاگنے لگیں۔ جمعہ کی دوپہر تھی ہفتے کا آخری دن۔ دھریتی اور ویشالی سب سے آخر میں کلاس سے نکلیں۔ جیسے ہی وہ باہر نکل رہی تھیں۔ ٹیچر نے دھریتی کو بلایا "دھریتی بیٹی، مضمون نہ لکھنے کے لیے جو وجہ تم نے بتائی وہ کچھ عجیب سی ہے۔" ٹیچر ہلکے سے ہنسیں اور کہا "تم کسی اور موضوع پر مضمون کیوں نہیں لکھتیں...... جیسے 'میری دادی کے بجائے میری خالہ' پر مضمون لکھو اور پیر کو لکھ کر لے آنا۔"

دھریتی کے بھیگے ہوئے گالوں پر مسکراہٹ آگئی اور اُس نے ہلکے سے کہا "ٹھیک ہے میڈم! شکریہ میڈم۔"

دھریتی کی پریشانی دور ہو گئی تھی۔ خالہ کے بارے میں دو دن کی چھٹی میں مضمون لکھنا کوئی مشکل بات نہیں تھی مگر اُس کے دماغ میں ایک بات گھوم رہی تھی۔ اُسے ایک دادی چاہئیں۔ کس طرح سے وہ ایک دادی حاصل کرے؟

ویشالی کی دادی بھی تھیں اور نانی بھی اور اُس کی پر دادی بھی موجود تھیں۔ اس لیے نہ صرف اُسے کلاس میں سب سے زیادہ نمبر ملے بلکہ گھر پر بھی وہ بہت مزے کرتی تھی۔ دادی اُسے سوتے وقت روز بلا ناغہ کہانیاں سُناتی تھیں۔ نانی اکثر ڈھیروں مزے دار چیزیں لے کر آتیں۔ اُس کی پر دادی حالانکہ ٹھیک سے سن نہیں پاتی تھیں مگر ان کی آنکھیں اتنی تیز ضرور تھیں کہ وہ ویشالی کے کپڑوں کا بہت باریکی سے جائزہ لے سکتی تھیں۔ مگر وہ اتنی بھلکڑ تھیں کہ ایک ہی سوال بار بار پوچھتیں۔ بڑا مزا آتا، ویشالی نے کہا۔ اُسے اپنی دادی، پردادی اور نانی کے ساتھ بہت مزا آتا ہے مگر دھریتی، اُس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ اُسے اپنی دادی یاد بھی نہیں تھیں۔

"میں ایک دادی خرید تو سکتی ہوں۔ اپنے جیب خرچ کے سارے پیسے میں اِسی میں لگا دوں گی" دھریتی نے کہا اور ایک لمبی سی سانس لی۔ وہ دونوں پیدل ہی اسکول سے گھر لوٹ رہے تھے۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو دھریتی" ویشالی نے کھِل کھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔

"تم دادی نہیں خرید سکتیں۔"

دونوں لڑکیاں الگ الگ راستے پر چلی گئیں کیوں دونوں کے گھر سڑک کی مخالف سمتوں میں تھے۔

اُس رات دھریتی نے پریوں کی ایک دادی کا خواب دیکھا جن کے دو بڑے بڑے سفید پنکھ تھے جن سے اڑتی ہوئی وہ اُس کے پاس آئیں۔ اُنھوں نے دھریتی کو ایک میٹھی لوری سنائی اور ہولے ہولے اُسے تھپ تھپایا اور گہری نیند سو گئی۔

اگلے دن دھریتی نے فیصلہ کر لیا کہ ▪▪ ایک دادی کی تلاش ضرور کرے گی۔ مگر کیسے؟ صبح سارے وقت وہ بے چینی سے اس بارے میں غور کرتی رہی مگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائی۔ وہ ویشالی کے گھر کی طرف بھاگنے ہی والی تھی کہ اُس کے ابّا نے اخبار سے سر اُٹھا کر اُس کی اماں سے کہا "بیٹا کشی! ایک اِشتہار ہے اُس میں 'ایک اچھا سا دو کمروں کا مکان بِک رہا ہے"

اچانک دھریتی کے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ اُس نے کچھ پرانے اخبار جمع کیے اور چھت پر بھاگ گئی۔ چھت پر آرام سے بیٹھ کر اُس نے اخبار چاروں طرف پھیلا دیے اور اِشتہاروں کے سب کالم دیکھنے لگی۔ فرنیچر' پالتو جانور' کاریں' مکان' قلمی دوستی' دولھا دلھن سب کے اِشتہار موجود تھے مگر دادی کا کوئی اِشتہار نہیں تھا۔

"اُف! میری تو آنکھیں دکھنے لگیں ان بے وقوفی کے اِشتہاروں کو دیکھ کر" دھریتی مایوسی سے بولی۔ اُس نے سارے اخبار ایک کونے میں ڈالے اور جلدی سے نیچے اتری۔

"میں ویشالی کے گھر لوڈو کھیلنے جا رہی ہوں۔" اُس نے چلا کر کہا اور دوڑ کر سڑک کے پار چلی گئی۔

دھریتی بہت جلدی میں تھی۔ حالانکہ سڑک پار کرتے وقت ▪▪ ہوشیار تھی مگر فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ جاتی ہوئی بوڑھی خاتون کو نہیں دیکھ پائی اور اُن سے جا ٹکرائی "ہائے! ہائے! ایسی جلدی بھی کیا ہے؟" بوڑھی خاتون چلائی اور بجلی کا کھمبا پکڑ کر اپنے آپ کو گرنے سے بچایا۔ اُن کے ہاتھ میں دبا کاغذ چھوٹا سا تھیلا گر گیا اور چاول کا آٹا زمین پر چاروں طرف بکھر گیا۔

"معاف کیجئے معاف کیجئے۔" دھریتی ہکلائی اور اپنے کپڑوں پر گرے چاول کے آٹو کو صاف کرنے لگی۔ "یہ آٹا آپ کیا بنانے کے لیے لے جا رہی تھیں؟" اُس نے بوڑھی خاتون کو اشتیاق سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ دُبلی پتلی کمزور سی تھیں' دھریتی سے بس ذرا سی ہی لمبی۔ اُن کی آنکھیں چھی چھی

مگر پیاری سی تھیں۔

"چڑیوں' چیونٹیوں اور دوسرے کیڑے مکوڑوں کے لیے لے جا رہی تھی جو صبح صبح کھانے کے تلاش میں نکلتے ہیں۔ اگر میں بھگوان کی اُس چھوٹی چھوٹی مخلوق کو کھانا کھلاؤں گی تو وہ میرا پیٹ بھرنے میں میری مدد کرے گا۔ مجھ جیسی لاچار کی اور کون مدد کر سکتا ہے؟" اُنھوں نے جواب دیا اور بہت دوستانہ انداز میں مسکرائیں۔

"آپ چھڑی لے کر کیوں نہیں چلتیں؟" دھریتی نے پوچھا۔ "معلوم ہے معلوم ہے' میں بوڑھی ہو رہی ہوں' اب مجھے چھڑی لے کر چلنا چاہیے' پر ابھی تو چھڑی ہے ہی نہیں میرے پاس" بوڑھی خاتون نے بڑے سکون سے دھریتی کو جواب دیا۔ اُن کے چہرے پر اب بھی دوستانہ مسکراہٹ تھی۔ تبھی دو شیطان لڑکے ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے بھاگتے ہوئے آئے۔ چھوٹا والا لڑکا دھریتی سے زور سے ٹکرایا' گرا اور رونے لگا۔

"بیوقوف" دھریتی بڑبڑائی۔

بوڑھی خاتون نے لڑکے کو اُٹھایا اُسے دلاسہ دیا اور پیار سے اُس کی کمر تھپ تھپا کر روانہ کر دیا۔ دھریتی ڈری سہمی کھڑی دیکھتی رہی۔

"اب بھاگ جاؤ پیاری بیٹی' اور ہوشیار رہنا۔ بوڑھی عورتوں کو آئندہ ٹکریں مت مارتی پھرنا۔ بوڑھی عورتیں بہت چڑ چڑی ہوتی ہیں۔ معلوم ہے نا تمھیں؟" بوڑھی خاتون نے اپنی سدابہار مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور اپنے راستے پر چلی گئیں۔ دھریتی ویشالی کے گھر چلی گئی۔

اُس رات دھریتی نے خواب میں دیکھا کہ دادی اپنے بڑے بڑے پروں پر چڑیاں' چیونٹیاں اور چھوٹے چھوٹے بچے بٹھائے اُس کے پاس آئی ہیں۔

اگلے دن دھریتی پر پھر چھت پر گئی۔ اب وہ اشتہار دیکھنے نہیں گئی تھی بلکہ خود ایک اشتہار لکھ رہی تھی۔ اُس نے فرش پر ایک چارٹ پیپر بچھایا اور اپنے رنگین پینوں سے لکھا "ضرورت ہے۔ ایک دادی کی۔"

ویشالی نے اُسے مشورہ دیا تھا کہ "بڑا بڑا لکھ کر ہم اُسے کمیونٹی ہال' کے نوٹس بورڈ پر لگا دیں گے۔"

دھریتی کو یہ مشورہ پسند آیا اور وہ اُس پر عمل کرنے لگی۔

اچانک اُسے کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اُچھل کر کھڑی ہو گئی اور منڈیر سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ فٹ پاتھ پر دو سانڈ دوڑ رہے تھے مگر چلایا کون تھا؟ وہی بوڑھی خاتون تھیں جن سے کل دھریتی ٹکرائی تھی۔ اُس وقت وہ فٹ پاتھ پر گری پڑی تھیں۔ اُن کے پاس ہی ایک چھڑی بھی پڑی ہوئی تھی۔ ایک منٹ کے میں ہی دھریتی سڑک پر بوڑھی خاتون کے پاس جھکی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا؟" اُس نے بہت آہستہ سے پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں" بوڑھی خاتون نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا اور اٹھنے کی کوشش کی۔ "یہ سانڈ اپیچھے سے اتنی تیزی سے آئے کہ میں اِن کے راستے سے ہٹ ہی نہیں پائی۔"

"کیا انھوں نے آپ کو ٹکر مار کر گرا لیا ہے؟"

"نہیں نہیں' اِنھوں نے نہیں۔۔۔ تو دائیں بائیں سے نکلے تھے بد قسمتی سے دائیں والا کچھ ذرا زیادہ ہی قریب سے نکلا اور اُس کا پیر میرے پیر پر پڑ گیا۔ اُف میں گر پڑی۔ میری عمر تو تم دیکھ ہی رہی ہو۔ آج تو میں یاد کر کے چھڑی بھی لے کر نکلی تھی۔" انھوں نے دھرتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اُن کے چہرے پر وہی میٹھی مسکراہٹ کھل اُٹھی۔

"ہے بھگوان! آپ کا اُلٹا پنجہ تو بُری سے زخمی ہے۔ خون نکل رہا ہے مجھے پکڑ لیجئے اور اُٹھنے کی کوشش کیجئے۔" دھرتی نے اُن کی ہمت بڑھائی۔ پھر وہ دونوں دھرتی کے گھر میں چلے گئے۔

پنجے میں سوجن آگئی تھی۔ بوڑھی خاتون درد سے تڑپ رہی تھیں۔ دھرتی کے ابّا نے ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر انھیں اپنے کلینک لے گیا۔ اُسے شک تھا کہ شاید پنجے میں فریکچر ہو گیا ہے۔

"کون تھیں یہ دھرتی؟" بوڑھی خاتون کو رخصت کر کے دھرتی کی اماں نے پوچھا۔

"ہے بھگوان!" دھرتی پریشانی سے چلائی۔ "مجھے واقعی نہیں معلوم۔ میں نے پوچھا ہی نہیں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ رہتی کہاں ہیں۔ میں تو اُن کا حال چال بھی نہیں پوچھ پاؤں گی۔" وہ جلدی جلدی پلکیں جھپکا رہی تھی اور اُس کی آنکھیں رہ رہ کر چمک رہیں تھیں۔

"پریشان مت ہو دھرتی' ہم ڈاکٹر سے معلوم کر لیں گے۔ اب جاؤ اپنی پڑھائی کرو" اُس کی اماں نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

دھرتی اپنے سبق کی تیاری کرنے چلی گئی۔ اُس نے اپنا مضمون لکھا۔ لمبا چوڑا مضمون تھا کیونکہ اُس نے مضمون میں تفصیل سے لکھا تھا کہ کس طرح اُس کی خالہ کو سانڈوں نے ٹکر ماری اور کس طرح گرنے کے بعد وہ ٹھیک ہوئیں۔ بعد میں اُس نے اپنے 'سپیلنگ ٹیسٹ' کی تیاری کی۔ اس لئے تھوڑی دیر کے لئے وہ اشتہار کو بھول گئی۔

اُس رات دھرتی کے ابّا نے ڈاکٹر کو فون کیا۔ ڈاکٹر ایک مہینے کے لئے باہر گئے ہوئے تھے۔ بس پھر دھرتی نے اپنے دماغ سے بوڑھی خاتون کے سارے خیال نکال دیئے اور اپنی پڑھائی میں لگ گئی۔

دھرتی کا ٹیسٹ اچھا ہوا۔ اُس کے مضمون کی بھی بہت تعریف ہوئی۔ اُس کا نتیجہ بھی اچھا

آیا اور اُس کی چھٹیاں شروع ہو گئیں۔

اُسے پھر سے اشتہار اور بوڑھی خاتون کے پنجے کا خیال آیا۔ ویشالی اور دھریتی نے اشتہار لکھنا شروع کیا۔ اب اشتہار کافی اچھا بن رہا تھا۔ گلہریوں کا ایک جوڑا منڈیر پر بیٹھا اُنھیں کام کرتے دیکھ رہا تھا۔

"ارے رُکو! میں پہلے جانوروں کے لئے تھوڑا چاول کا آٹا لے آؤں" دھریتی چلائی۔

"مگر یہ تو بھاگ جائیں گے" ویشالی نے بحث کی۔

"کوئی بات نہیں۔ میں دیوار پر ڈال کر چھوڑ دوں گی۔ یہ بعد میں آکر کھالیں گے۔"

دھریتی نے اُٹھتے اُٹھتے گلہریوں پر نظر ڈالی۔ گلہریوں نے بھی پل بھر کے لیے اُسے حیرت سے دیکھا اور اگلے ہی پل ... بھاگ لیں۔ جب دھریتی یہ دیکھنے کے لیے گئی کہ وہ کدھر گئی ہیں تو وہ خوشی سے چلا اُٹھی۔

"ارے! وہ آگئیں!"

"کون؟" ویشالی نے پوچھا۔

"وہ بوڑھی خاتون۔ جلدی آؤ نیچے چلیں" وہ دوڑ کر سڑک پر پہنچیں۔

"اوہ! آپ آگئیں" دھریتی بہت آہستہ آہستہ لنگڑا کر اپنی طرف آتی ہوئی بوڑھی خاتون کا ہاتھ پکڑ کر چلائی "آپ ٹھیک تو ہیں؟"

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔ میں تم سب لوگوں کا شکریہ ادا کرنے تمھارے ہی گھر آ رہی تھی۔"

"اماں! دیکھئے کون آیا ہے؟" دھریتی نے چلا کر کہا۔

تھوڑی دیر میں سب لوگ اندر جا کر بیٹھ گئے۔ بوڑھی خاتون نے آنکھوں میں آنسو بھر کر دھریتی کے ابا اماں کا شکریہ ادا کیا کہ ان لوگوں نے اُنھیں بہت اچھے ڈاکٹر کے حوالے کیا جس نے شہر سے باہر جانے سے پہلے اُس کے پیر پر پلاسٹر چڑھا دیا۔ دو ہفتے پہلے ڈاکٹر کے ماتحت نے اُن کا پلاسٹر نکال دیا۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ اُنھوں نے کہا "میں کچھ خاص تحفہ دھریتی کو دینا چاہتی ہوں۔ پیاری بٹیا۔ کیا چاہیے تمھیں؟" اُنھوں نے دھریتی سے بہت پیار سے پوچھا۔

"ارے نہیں' کچھ نہیں' بس مجھے ایک دادی چاہئیں۔ کیا آپ میری دادی بنیں گی؟"

دھرتی بے قراری سے چلائی۔ وہ گھٹنوں کے بل بوڑھی خاتون کے پاس بیٹھ گئی اور امید بھری نظروں سے ان کے مسکراتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

سب بوڑھی خاتون کی طرف دیکھنے لگے۔ حیرت سے اُن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اُن کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد اُنھوں نے کہا "کیوں نہیں؟ کیوں نہیں پیاری بٹیا؟ میرا اِس دنیا میں کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں ہے۔ میں بالکل اکیلی رہتی ہوں۔"

"پر اب آپ اکیلی نہیں رہیں گی۔" دھرتی کی اماں نے کہا "اب ہم سب آپ کے ہیں۔"

اُنھوں نے بوڑھی خاتون کا ہاتھ پیار سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دھرتی کے ابا پاس کھڑے مسکرا رہے تھے۔

بھیڑوں کی گنتی

دیوار پر لگی گھڑی نے 7.45 بجائے۔ آخری مریض چلا گیا۔ ڈاکٹر شیر سنگھ نے چشمہ اُتارا' اپنی تھکی ہوئی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور اپنے آپ کو ایک گہری اور لمبی جماہی کے ساتھ عیش کرنے کی اجازت دے دی۔ جانوروں کا ڈاکٹر ہونا بھی بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ وہ اُٹھے اور اپنا سامان بیگ میں رکھنے لگے۔ مختلف طرح کے آلے اسٹیتھسکوپ وغیرہ اور چھوٹی سی ہتھوڑی۔ جب ٹارچ بھی اندر پہنچ گئی تو اُنھوں نے بیگ بند کر دیا۔

"اب گھر چلا جائے۔" ڈاکٹر شیر سنگھ نے کہا۔

مگر اُن کے قدم بڑھانے سے پہلے ہی دروازہ بھڑاک سے کھلا اور جو چیز اندر گھسی وہ یقیناً اب تک پیدا ہونے والے کتّوں میں سب سے بڑا کتّا تھا۔ وہ چلتا کیا تھا جھومتا زیادہ تھا۔ لڑکھڑاتا ہوا وہ مریضوں کی کرسی پر بیٹھنے لگا مگر بیٹھنے کے بجائے دھم سے فرش پر لڑھک گیا' ٹانگیں پھیل گئیں اور آنکھیں گول گول گھومنے لگیں۔ اُس کی سانس رُک رُک کے آ رہی تھی۔

ڈاکٹر شیر سنگھ فوراً حرکت میں آ گئے۔ اُنھوں نے جھٹ پٹ اپنا بیگ کھولا اور آلہ نکالا۔ ایک جھٹکے میں اُنھوں نے کتّے کو پلٹا اور اُس کے دل کا معائنہ کرنے لگے۔ آلے کے ذریعے آنے والی آواز ایسی تھی جیسے گھوڑے دوڑ رہے ہوں۔ بالکل صاف اور بہت تیز۔ ڈاکٹر شیر سنگھ نے مریض کے ہاتھ پیروں کی حرکت کی بھی جانچ کی۔ وہ سب بالکل ٹھیک تھا' اور ناک اتنی ٹھنڈی اور نم تھی جیسے برف کا کوئی ٹکڑا۔ "کھڑے ہو جاؤ" ڈاکٹر شیر سنگھ نے تیز آواز میں کہا۔ "تم بالکل ٹھیک اور صحت مند ہو۔"

"کون' میں؟" کتّا بڑبڑایا' آنکھیں اب بھی گول گول گھوم رہی تھیں۔ "کون کہتا ہے میں ٹھیک ہوں' صحت مند ہوں؟"

"میں کہتا ہوں۔ بھلا کیا پریشانی ہے تمھیں؟"

"بہت سی پریشانیاں ہیں ڈاکٹر۔ بہت سی۔ میں سو نہیں سکتا۔"

ڈاکٹر شیر سنگھ نے خالص کاروباری انداز میں کہا۔ "ہوں' کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ تم کرسی پر اُٹھ کر بیٹھو؟ پھر ہم بات کرسکیں گے۔" وہ کتا پہلے کروٹ لے کر پیٹ کے بل لیٹا پھر لڑکھڑا کر پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ "اگر میں اپنا منہ آپ کی میز پر رکھ لوں تو آپ بُرا تو نہیں مانیں گے؟" اُس نے پوچھا۔ آخر وہ آرام سے کھڑا ہو گیا۔ "پوچھیے ڈاکٹر" اُس نے ایک آنکھ کھول کر کہا۔

ڈاکٹر شیر سنگھ نے گلا صاف کیا۔ "سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ تم اتنے بڑے کیسے ہو؟"

"میرے دادا پردادا میں سے ایک 'گریٹ ڈین' (کتے کی ایک قسم) تھے۔"

"اچھا ملی جلی نسل اور وہی سب کچھ" ڈاکٹر شیر سنگھ منہ ہی منہ میں بڑبڑائے۔ "ایسے معاملات میں کچھ پتا نہیں کیا کیا ہو سکتا ہے۔" اُنھوں نے اپنے پیڈ پر جلدی جلدی کچھ لکھا۔

"نیند نہ آنے کی بیماری تمھیں کب سے ہے؟"

"لگ بھگ دو مہینے سے۔"

"اس زمانے میں کھانے میں کچھ تبدیلی تو نہیں کی؟"

"ڈاکٹر" مریض نے درد بھری آواز میں کہا۔ "تبدیلی کرنا تو ضروری تھا اپنی طاقت کو بنائے رکھنے کے لئے۔"

"ہاں۔۔ تو تمہاری توند سے پتا چل رہا ہے۔ سونے کس وقت لیٹتے ہو؟"

"دس بجے کے آس پاس۔ میرے اوقات انسانوں کی طرح ہیں' میں اُن کے لیے کام کرتا ہوں نا۔"

"نیند لانے کے لیے کسی خاص چیز کا استعمال کیا؟"

"کیوں نہیں کیا۔ سونے سے پہلے ٹہل کر دیکھا' گرم پی کر دیکھا' ٹھنڈا پی کر دیکھا۔ پیٹ بھر کر کھایا' آدھے پیٹ کھایا... میں نے نائٹ کیپ پہن کر بھی سونے کی کوشش کی مگر کوئی چیز کام نہ آئی۔"

"نیند لانے کے خاص نسخے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ جب سے نیا (موڈرن) علاج شروع ہوا ہے تب سے ڈاکٹر نیند نہ آنے کی بیماری کے لیے ایک ہی علاج تجویز کرتے آرہے ہیں۔ خیالی بھیڑوں کی گنتی کرنا۔"

مریض کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ نتھنے پھڑکنے لگے' وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "ڈاکٹر"۔۔

زور سے غرّایا' "ڈاکٹر خدا کے واسطے یہ' یہ لفظ میرے سامنے منہ سے مت نکالیے۔ میں سارے دن کچھ نہیں کرتا سوائے بھیڑیں گننے کے۔ میں مکو ہوں۔ بھیڑوں کی رکھوالی کرنے والا کتا!"

"مگر اُس سے تو تمہاری نیند غائب نہیں ہونی چاہیے۔"

"اونہہ' مگر ایسا ہی ہوا ہے۔ ان ہی نامراد چیزوں کا پیچھا میں نے سارے دن کیا ہے۔ لوگ جنھیں بھیڑیں کہتے ہیں۔ یہ تو کسی سادھو سنت کو بھی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر سر پھوڑنے پر مجبور

کر دیں۔ یہ بنی ہیں سڑک پر غول کے غول بن کر نکلنے اور چراگاہ جانے کے لیے۔ پر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ ایسا کرتی ہیں؟ کبھی نہیں۔ سیلانی طبیعت ہے اِن کی عقل سے کوسوں دور سیلانی طبیعت۔ جدھر منہ اٹھا چل پڑیں اور میں اِن کو گھیر تا پھر تا ہوں' پہاڑوں پر اوپر نیچے' جھاڑیوں کے اندر باہر۔ پتھروں کے پیچھے اور غاروں میں......"

"رُکو' رُکو" ڈاکٹر شیر سنگھ نے کہا" جذباتی مت ہو"

"چھوڑیئے ڈاکٹر آپ بھی اُسی طرح جذباتی ہو جائیں گے اگر آپ کو بھی جینے کے لیے اُسی طرح بھیڑوں کی رکھوالی کرنی پڑے۔ سارے دن کے بعد میں اتنا جھنجھلایا ہوا ہوتا ہوں کہ سو نہیں پاتا۔"

"تو پھر تم کچھ تبدیلی کیوں نہیں پیدا کرتے؟"

"کیسے کر سکتا ہوں؟" کبھی سُنا ہے کہ بھیڑوں کی رکھوالی کرنے والے کُتے نے بھیڑوں کی رکھوالی کے علاوہ کسی اور چیز کی رکھوالی کی ہو؟"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے ہم ابھی تمھیں ٹھیک کر دیتے ہیں گھبراؤ نہیں"

"نیند کی گولیاں؟" بھیڑوں کے رکھوالے کُتے نے پوچھا۔

"نہیں' نہیں تمھیں نیند کی گولیوں کا عادی نہیں بننا چاہیے۔ بری عادت ہے۔ میں بتاؤں۔ جب تم گھر جاؤ تو اپنے بستر کی جگہ بدل لینا اور بھیڑوں کے بجائے کوے گِننا۔"

مریض کی آنکھوں میں امید کی ہلکی سی کرن جگمگائی۔ "ہاں یہ ٹھیک لگتا ہے۔ میں بھیڑیں گنتے گنتے تھک گیا ہوں۔ شکریہ ڈاکٹر۔ جلدی ہی پھر ملیں گے۔"

دو دن بعد وہ پھر واپس آ گیا۔ ایک نظر دیکھ کر ہی ڈاکٹر شیر سنگھ کو اندازہ ہو گیا کہ اُس کی حالت اور بھی خراب ہے۔ "ہائے ڈاکٹر" وہ دردناک آواز میں بولا۔ "میں تصور میں کوّے گِنتا رہا اور وہ مسلسل کاؤں کاؤں کرتے رہے۔ آخر وہ کاؤں کاؤں اتنی تیز ہو گئی کہ میں کاؤں کاؤں کے علاوہ کچھ نہیں سُن سکا۔"

"ہوں" ڈاکٹر شیر سنگھ نے کہا" مجھے لگتا ہے گِنتی تمھارے لیے مشکل کام ہے۔ اُس سے تمھیں پریشانی ہوتی ہے۔"

"ہمیشہ سے۔ میں اسکول میں حساب کی کلاس میں رو دیا کرتا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم گنتی کا خیال چھوڑ دیتے ہیں۔ کیوں ہے نا؟" "نمبروں کو بھول جاؤ۔ بھول جاؤ کہ کبھی تم نے ایک' دو' تین' چار کہنا سیکھا تھا..... اُس کے بجائے تصور کرو کہ تم باغ میں ہو جہاں بہت سے خوبصورت' رنگین' پھول ہیں۔"

"گھاس بھی؟" کتے نے کہا۔

"ہاں ہاں"

"اور ایک گیند بھی؟ نرم ملائم ہری گھاس پر گیند کے پیچھے دوڑنے میں کتنا مزا آتا ہے۔"

"کیا تم مجھے بولنے کا موقع دو گے؟" ڈاکٹر نے ڈانٹا۔

"اُس باغ میں تم بھیڑوں کی رکھوالی والے کتے نہیں ایک شہد کی مکھی ہو۔"

"کیا ہوں؟"

"ایک شہد کی مکھی۔ جو ایک پھول سے دوسرے پھول پر بھن بھن کرتی اُڑ رہی ہے۔"

"کیا آپ کو یقین ہے یہ ترکیب کامیاب رہے گی ڈاکٹر؟"

"تو پھر میں کیوں بتا رہا ہوں تمھیں؟"

"پھولوں وغیرہ کے بارے میں سوچنے کے علاوہ اور کیا کرتا ہو گا؟"

"کچھ نہیں بس' کہو بھن۔ بھن۔ بھن۔ بھن۔ بس کچھ دن کوشش کرو۔ یہ ترکیب جادو کا سا اثر کرے گی۔"

"اچھا؟ ٹھیک ہے ڈاکٹر۔ شکریہ۔ جمعے کو ملوں گا آپ سے۔"

مگر وہ جمعے کو نہیں آیا۔ سنیچر کو وہ لڑکھڑاتا ہوا آیا۔ اُس کی آنکھوں میں اتنی وحشت اُس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ اپنے سر پر ایک تھیلے میں برف رکھے جسے وہ اپنے پنجے سے سنبھالے ہوئے تھا" ڈاکٹر" وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر کیا آپ کسی طرح میرے سر سے یہ بھنبھناہٹ دور کر سکتے ہیں؟ ایسا لگ رہا ہے کہ سر نہیں شہد کی مکھیوں کا بڑا سا چھتا ہے۔"

ڈاکٹر نے تیز لہجے میں کہا" آنکھیں کھولو اور میری طرف دیکھو۔" مریض نے کہنا مانا۔ "ہاں

رہی تھیں۔"اُن کی یہ ہمت؟" وہ چلایا "ارے میں تو اُنھیں ایک ساتھ رکھنے کے لیے اتنی محنت کرتا ہوں۔ خطروں سے بچاتا ہوں۔"

"یہ بات ۔۔۔ تم اُن کو ہڑکا ہڑکا کر ایک گلّے میں رکھتے ہو۔ گولے سے ایک قدم باہر نہیں نکالنے دیتے۔ رس دار گھاس کا ایک تنکا بھی تلاش نہیں کرنے دیتے۔"

"اونہہ! ہر وقت تو کھاتی رہتی ہیں۔" کتّے نے کہا' مگر اب اُس کے لہجے میں پہلے جیسا غصہ نہیں تھا۔

"وہ کھاتی تو ہیں" ڈاکٹر نے پھر سے کہا "مگر اُنھیں تھوڑی سی اور آزادی چاہیے۔ تھوڑا سا سکون۔ نہ یہ کہ کوئی اُن پر ہر وقت بھونکتا رہے۔"

"واقعی یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔"

"یہی بات ہے۔ اور کبھی تم نے یہ سوچا کہ تمھیں نیند کیوں نہیں آتی؟" بھیڑوں کی رکھوالی والے کتّے نے سر جھکا لیا اور اب وہ خود بھیڑ سا لگ رہا تھا "اس لیے کہ تم سارے دن بھیڑوں پر بھونکتے ہو۔ سارے دن تم دانت نکال نکال کر غراتے ہو' غصے میں اپنے آپ کو پاگل کیے رہتے ہو اس لئے رات کو سو نہیں پاتے۔ فرض کرو اگر تم بھیڑوں کو تھوڑی آزادی دے دو! تو میں شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں کہ تم کو زیادہ نیند مل جائے گی۔"

کمرے میں خاموشی ہو گئی۔ پھر آہستہ سے رکھوالا کتا اٹھا "سلام کرتا ہوں ڈاکٹر آپ کو" اُس نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ اس بار آپ نے میرا مرض پکڑ لیا ہے۔"

"مجھے حال بتا دینا' بتاؤ گے نا؟"

"ضرور" کتّے نے کہا اور جھک کر برف کا تھیلا اُٹھایا۔ ڈاکٹر کے سامنے ذرا سا جھک کر اُس نے تھیلا میز پر رکھ دیا۔ "میری طرف سے بے خوابی کے مریض کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ تحفہ۔" اُس نے دم ہلائی اور چلا گیا۔ ایک ہفتے بعد ڈاکٹر شیر سنگھ کو ڈاک سے اُن کی فیس اور ایک شکریہ کا کارڈ ملا جس پر لکھا تھا۔

سوتا ہے ایسے پڑا، جیسے لکڑی کا لٹھا
ملّو، وہی بھیڑوں کی، رکھوالی والا کتّا

نوٹ: ڈاکٹر، کیا آپ دن میں جاگتے رہنے کے لیے میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟
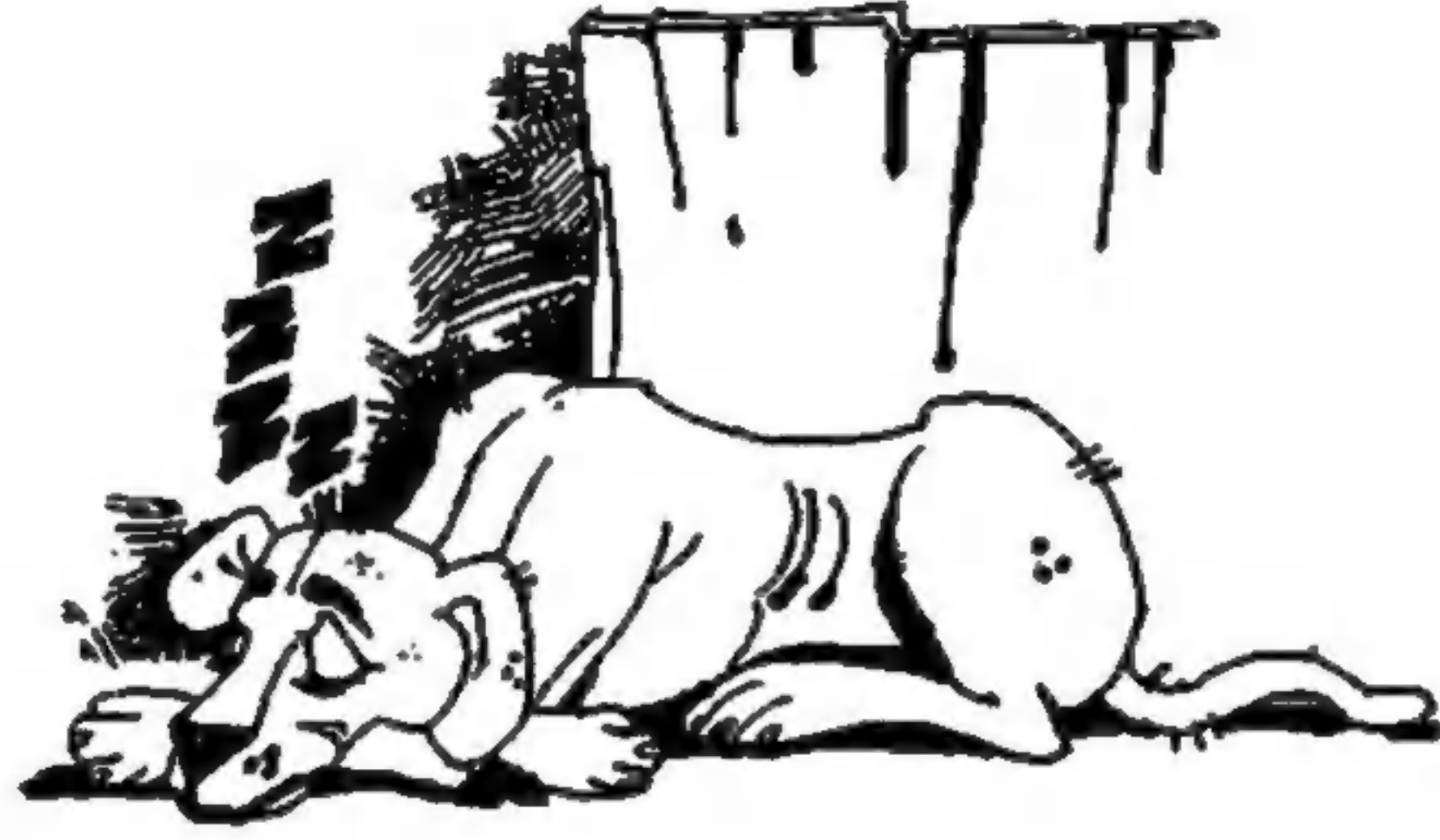
موڑدی۔ کچوری لال بازاروں، چھوٹی چھوٹی بھیڑ بھاڑ والی سڑکوں سے گزر رہا تھا۔ گلیوں کے نکڑوں پر باتیں کرتے ہوئے لوگوں اور ڈھابوں پر چائے پینے والوں کو ڈراتا اور دہشت زدہ کرتا ہوا۔ دوسری طرف ددر باز سنگھ بھی دل و جان سے پیچھا کرنے میں لگا تھا۔

انکل سامنتا نے تھوڑی دیر صورت حال کا جائزہ لیا، اور پھر اپنی ریوالور نکال کر سامنے بھاگتی ہوئی بیوک کار پر فائر کیا۔ کار نے ایک دم سیدھے ہاتھ کو مڑ کر فائر سے بچاؤ کیا۔

"میری کار میری کار، کسی بھی طرح میری کار واپس لو۔" "مہربانی کر کے خاموش بیٹھے رہیے" انکل سامنتا نے سکون سے کہا۔ "یہ چیخنے چلانے کا وقت نہیں ہے۔ آپ کو آپ کی کار ضرور واپس مل جائے گی۔" "سردار جی۔" اُنھوں نے سرگوشی میں دور باز سنگھ سے کہا۔ "ذرا اور تیز کیجیے۔
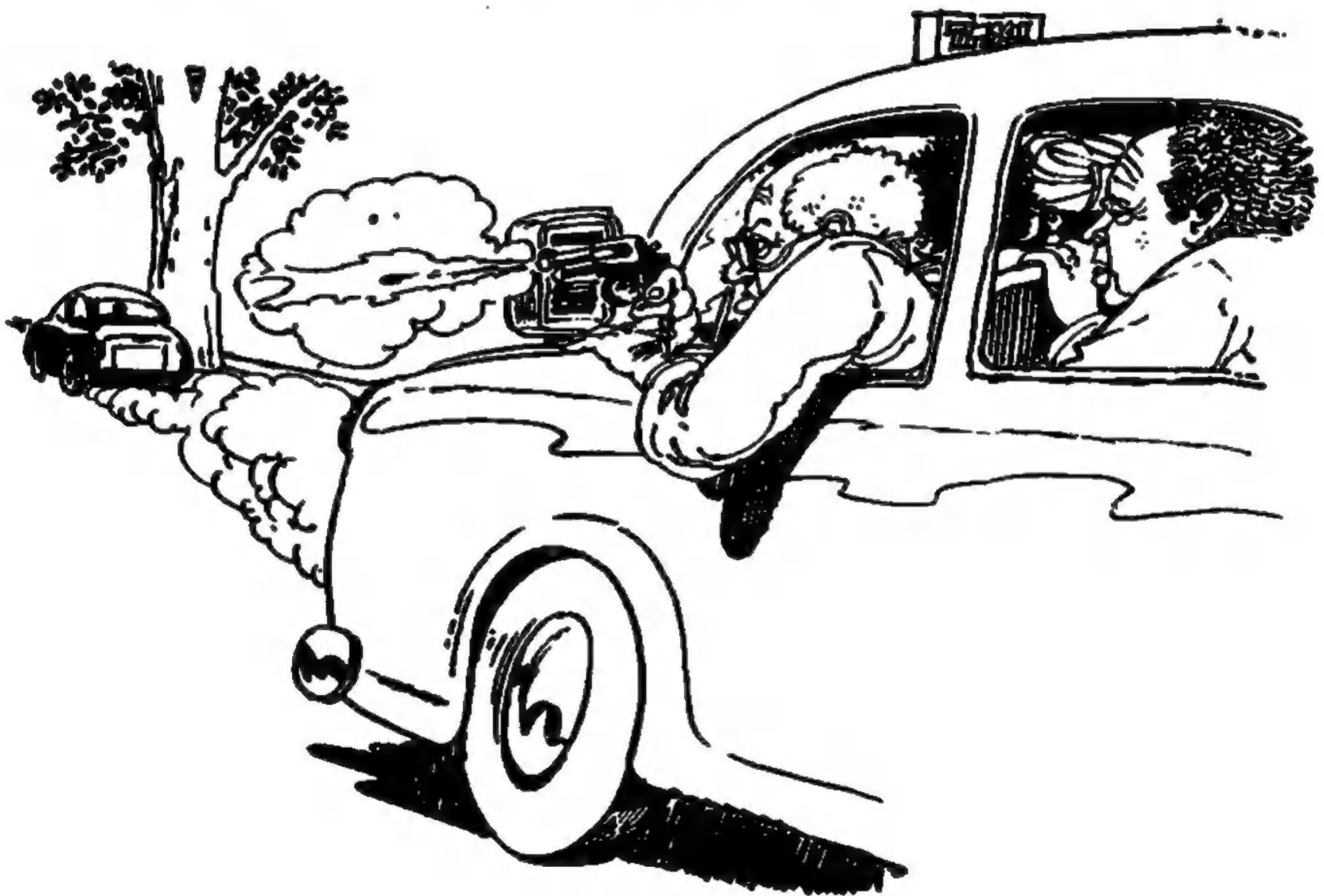
مجھے اتنا قریب پہنچادیں کہ میری ریوالور کی گولی کار تک چلی جائے۔ بس پھر مجھ پر چھوڑ دیجئے' میں سنبھال لوں گا۔"

دور باز سنگھ نے اور زور سے ایکسیلیٹر دبایا اور "جے بجرنگ بلی" کا نعرہ لگایا کچوری لال والی کار کے قریب آتے ہی انکل سامنتا نے فائر کیا اور گولی بیوک کار کے بڑ میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی۔

جگا چلایا "وہ مارا"

انکل نے دوسرا فائر کیا جو کار کی پچھلی کھڑکی پر لگا۔ شاید کچوری لال ذرا سی دیر کے لئے گھبرا گیا کیونکہ کار ذرا دیر کو رکی ہوئی سی لگی۔ بے باک جاسوس نے تیسرا فائر کیا۔ جو مڈ گارڈ پر لگا۔ چوتھا فائر کار کے ٹائر سے پار ہو گیا۔ پانچویں فائر نے کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا اور کار رک گئی۔

"شاباش!" جگا خوشی سے چلایا "واہ! جواب نہیں سر!"

"یہ تو بالکل بمبئی کی کسی ہٹ فلم جیسا ہے۔ مجھے تو بہت مزا آیا"

"مجھے بھی" دور باز سنگھ نے بھی بتیسی دکھاتے ہوئے کہا۔

انکل سامنتا اتنا فخر محسوس کر رہے تھے جتنا ہمالیہ پہاڑ پر پہلی بار قدم رکھ کر 'تین زنگ نورگے' نے کیا ہوگا۔

لکھیارام نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور دوڑ کر اپنی کار کی طرف گیا۔ اُسے اپنی کار واپس لینے اور بدنام چور کو پکڑنے کی بہت جلدی تھی۔

مگر کچوری لال بھی ایک نمبر کا مکار تھا۔ اُس نے پلک جھپکتے کار کا دروازہ کھولا اور خرگوش کی طرح دوڑتا ہوا ایک بڑے سے جوٹ مل کے گودام کے پیچھے غائب ہو گیا۔

انکل سامنتا اُس کے پیچھے دوڑے مگر وہ کائیاں آدمی اُن سے زیادہ تیز رفتار تھا۔ اُن کی ریوالور میں اب گولیاں بھی نہیں تھیں اس لئے وہ ٹال گئے۔

"سوری' میں چور کو نہیں پکڑ سکا۔" اُنھوں نے لکھیارام سے کہا۔

آپ نے میری کار کا وہ حال کیا ہے کہ اب اُس کی مرمت بھی نہیں ہو سکتی۔ دیکھئے یہ ٹائر' یہ شیشے اور بڑ سب کٹے پھٹے پڑے ہیں۔ اب میں اِس کباڑے کا کیا کروں گا............؟"

"لیس سر" اُس نے کہا۔
"اِنھیں پیسے دے دو" کپور نے حکم دیا۔
گنجن نے جلدی سے بریف کیس کھولا اور ایک نوٹوں کی گڈی نکالی۔
"یہ پانچ ہزار ہیں" کپور نے کہا۔ "میرا خیال ہے یہ کافی رہیں گے۔ برائے مہربانی اس رسید پر دستخط کر دیجئے۔"
انکل سامنتا نے نوٹوں کی گڈی لے کر رسید پر دستخط کر دیئے۔
"شکریہ" کپور نے ایک نظر رسید پر ڈال کر اُسے گنجن کو دے دیا "آپ نے مجھے بڑی مشکلوں سے بچالیا۔ جب فلم پوری ہو جائے گی تو میں آپ کو ٹکٹ تحفے میں بھیجوں گا۔ اب مجھے جلدی سے اسٹوڈیو پہنچنا ہے کچھ ایڈیٹنگ کرنی ہے۔"
"مزا آگیا' مزا آگیا!" کپور اور اُس کے ساتھیوں کے جاتے ہی جگّا خوشی سے اُچھل کر چلّایا۔
"جے بجرنگ بلی" دور باز سنگھ نے نعرہ لگایا اور سڑک پر بھنگڑا کرنے لگا۔ "ارے بابو جی مجھے بھی بہت ہی خوشی ہو رہی ہے۔ میری ٹیکسی فلم میں دکھائی جائے گی۔ ارے کتنا شبھ دن تھا آج' یقین نہیں آتا"
انکل سامنتا اتنے خوش تھے کہ منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔ ایک منٹ بعد اُنھوں نے گڈی میں سے چھ سو روپے نکال کر دور باز سنگھ کو دیئے۔ "سو روپے بخشش کے رکھو سردار جی' اب جاؤ اور اپنا کھانا کھاؤ۔ پہلے ہی دیر ہو گئی ہے تمھیں۔"
"چلتے چلتے۔ جیو بابو جی" دور باز سنگھ نے کہا۔ "مگر یہ کیا بات کہی آپ نے کہ جاؤ اپنا کھانا کھاؤ۔ بابو جی۔ آپ دونوں لوگ بھی میرے ساتھ آؤ آج میرے ساتھ میرے خاص ڈھابے پر چلو۔ آج میں دعوت کرتا ہوں۔ میں کہتا ہوں' ایسے لاجواب پراٹھے اور مرغے کا سالن آپ نے کبھی نہیں کھایا ہوگا...... ہے واہے گرو' کیا بڑھیا دن ہے آج' میری ٹیکسی اور میں دونوں فلم میں دکھائے جائیں گے......"
اُس نے اپنے پسندیدہ فلمی گانے کی دُھن پر سیٹی بجاتے ہوئے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور وہ تینوں اندر بیٹھ گئے۔ ٹیکسی اتنی تیزی سے روانہ ہوئی جیسے اب بھی کچوری لال کا پیچھا کر رہی ہو۔